مغربی سیاح کی ڈائری

کے

چند صفحے

از خامہ

مولانا ابو المعانی

سابق جوائنٹ ایڈیٹر اخبار خطیب

باہتمام ملا محمد الواحدی سنہ ۱۳۳۶ھ

درویش پریس دہلی میں چھپی و شائع ہوئی

قیمت علاوہ محصول ڈاک [illegible] آنے

ضروری گذارش

یہ تحریر جواب کتاب کی صورت میں پیش کی جا رہی ہے، پہلے ایک مسلسل مضمون کی حیثیت سے اخبار خطیب دہلی میں شایع ہوئی ہے، اس کے لکھنے والے مولٰنا ابو المعانی (سابق جوائنٹ ایڈیٹر اخبار مذکور) ہیں، انہوں نے اس میں ہوم رول کی تحریک کو مسلمانوں کے لیے مضر بتایا ہے، اور پہلے خطیب کا بھی یہی خیال تھا لیکن کچھ عرصہ سے خطیب ہوم رول کا حامی ہو گیا ہے، میری رائے ہے کہ ناظرین مولٰنا ابو المعانی یا خطیب کی پچھلی پالیسی کے ساتھ خطیب کے موجودہ بیانات کو بھی دیکھیں، اور اس بارۂ خاص میں کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنے کی سعی کریں،

مرتب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پہلا صفحہ

غالباً میری سیاحت ہند اور سیاحت ہند کیا سارے کرۂ ارض کی سیاحت
ناکامل ہی جائے گی۔ اگر میں اہل ہند کے نظام سلطنت کے متعلق کوئی گفتگو نہ کروں۔ کیونکہ
ساری دنیا کی سیاحت میں جو سب سے زیادہ عجیب و غریب چیز مجھ کو نظر آئی۔ وہ
یہی تھی۔ کہ ہند کا نظم و نسق کس طرح ہوتا ہے۔ اس کے اصول کیا ہیں اور اس کا کیا
اثر پبلک پر پڑتا ہے۔ اس میں کلام نہیں۔ کہ یہ حصہ میرے سفرنامہ کا بعض احباب کو
خشک و بے نمک نظر آئے گا۔ لیکن بحیثیت ایک ایسے سیاح ہونے کے جس کا تعلق
سلطنت مریخ سے بھی اسی درجہ کا ہے جس درجہ اُس کو پبلک سے وابستگی ہے۔ میرا یہ فرض
ہے۔ کہ اس پر ایک بسیط گفتگو کروں اور اپنی معلومات کے اس حصہ میں جگہ دوں جو باعتبار
اپنے نتائج کے گو زیادہ اہم نہیں۔ لیکن عجیب و غریب ضرور ہے۔

میں یہ پہلے صفحات میں بیان کر چکا ہوں۔ کہ ہند کی یہ عجیب خصوصیت کہ وہاں کا
ہر آدمی ایک نیا رنگ و مزاج ایک جداگانہ مذاق و طبیعت رکھتا ہے اور نہیں پائی جسمانی
لیکن اس سے زیادہ حیرت انگیز امر میں اب بیان کروں گا۔ اور وہ یہ ہے کہ جس زمانہ
میں میں نے وہاں کی سیاحت کی تو معلوم ہوا کہ بلا مبالغہ اس تضاد طبائع اور اس

مخالف امزجہ کے وہاں ایک مخلوط گورنمنٹ ہے جس میں سرد و گرم خشک و رطب
کے مختلف المزاج والے لوگ اسی طرح ملے ہوئے ہیں، جس طرح ہمارے ملک مریخ میں اضداد عنصری
کے اصول پر علم کیمیا کے جاننے والے مختلف مزاج کے غازوں کو مخلوط کرکے ایک شیشہ
میں بند کر دیتے ہیں۔ اور پھر وہ شیشہ پاش پاش ہو جاتا ہے۔ اس گورنمنٹ کو جس کی
ترکیب کو سوائے اس کے کہ قدرت خداوندی کا ایک نمونہ کہا جائے، اور کچھ نہیں سمجھا
سکتا، ہند کے لوگ اپنی زبان میں نہیں۔ بلکہ اس زبان میں جس کے بولنے والے ایک
دوسرے اور بہت بعید ملک کے رہنے والے ہیں (یہ دوسری عجیب بات ہے) سلف
گورنمنٹ کہتے ہیں۔ آپ لوگ متحیر ہونگے۔ کہ یہ کیا بلا ہے۔ اور افسوس ہے کہ میں بھی اسقدر
جلد آپ کی حیرت و استعجاب کو نہیں مٹا سکتا۔ کیونکہ اس کے سمجھانے کے لیے مجھے تاریخ
ہند کے بہت سے پچھلے صفحات پلٹ کر آپ کے سامنے رکھنے پڑیں گے جسطرح مجھے
اول اول خود سمجھنے میں کرنا پڑا تھا۔ اور پھر کچھ کچھ آپ جان سکیں گے۔ کہ یہ سلف گورنمنٹ
کیا چیز ہے۔ یہ امر بھی ذہن نشین کر لینا چاہیئے، کہ اس سلف گورنمنٹ کی بنیاد کو پڑے
ہوئے، ابھی بہت زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ اور بعض کا خیال ہے کہ صحیح معنے میں۔ تو وہ
اسی سال ملی ہے جس سال میں وہاں بغرض سیاحت پہنچا تھا، اب سے کوئی چالیس
سال پہلے سلطنت کا نظم اس صورت پر نہ ہوتا تھا۔ بلکہ اس کا طریقہ دوسرا تھا۔ اب تو یہ
ہے۔ کہ تمام معاملات خواہ ان کا تعلق داخلی انتظام سے ہو یا خارجی سے خود ملک کے
لوگ ایک جگہ بیٹھ کر کرتے ہیں، اور پہلے یہ تھا۔ کہ ایک اور قوم جو یورپ کی رہنے والی تھی
اور جس کا اب بھی بہت کچھ اقتدار و انتظام ہند میں ہے، خود سارا انتظام کرتی تھی اور
ملک کے کسی آدمی کو اس میں دخل نہ تھا۔ مالگزاری کا وصول کرنا۔ اس کے اخراجات کی
مدیں قائم کرنا، محکمہ جات میں تہذیب و ترتیب کی غرض سے سارا عزل و نصب وغیرہ اسی قوم
کے ایک سب سے زیادہ دانشمند کے ہاتھ میں ہوتا تھا جس کو وائسرائے کہتے تھے اس وائسرائے

کے ماتحت قریب قریب دہی اختیار رکھنے والے چار پانچ لوگ اور ہوتے تھے جنکو لفٹننٹ گورنر کے نام سے پکارتے تھے، وائسرائے اور لفٹننٹ گورنروں کے ہاں مجالس شورائے بھی تہیں جنکو وہ کونسل کہتے تھے، اور اسمیں خاص ہندوستان کے بھی دو چار لوگ بہ حیثیت مشیر رہا کرتے تھے۔ لیکن سنا ہے کہ ان مجالس میں کبھی کوئی فیصلہ ایسا نہیں ہوا جس میں ہندوستان کے مشیروں کے جذبات و داعیات کا لحاظ کیا گیا ہو۔ جب اس حالت کو قائم ہوئے، اک زمانہ ہو گیا۔ تو ہندوستان کے اصلی باشندوں نے اس بات کو اول اول محسوس کیا۔ کہ شاید اجلے رنگ کی حکومت شیام رنگ کی رعایا کے ساتھہ پورا انصاف کرنا پسند نہیں کرتی۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں۔ کہ ہمیں پورا درخور انتظامی معاملات میں حاصل نہ ہو۔ اور بعض عہدے جنکا تعلق براہ راست پبلک کی رفاہ سے ہے ہم کو نہ عطا ہوں یہ ایک خیال تھا، جو بعض بعض دماغوں میں پیدا ہوا۔ اور وہیں دفن ہو کر رہ گیا، چونکہ اس قوم کو محکومیت کی حالت میں بسر کرتے ہوئے ایک زمانہ گذر چکا تھا۔ اور اس یورپ سے آنے والی قوم کی حکومت سے پہلے ہی وہ صدیوں تک اس قوم کی حکومت برداشت کر چکی تھی، جو اب محکومی میں اسکے دوش بدوش ہے۔ اس لیئے ان کے فاتحانہ جذبات اک حد تک فنا ہو چکے تھے اور اس لیئے اس قوم کے دانشمندوں کا یہ خیال تھا۔ کہ اگر ہماری ساتھی قوم بھی اس خیال کی پرورش اپنے دماغ میں کرے تو زیادہ کامیابی کی امید ہے۔

غالباً اس جگہ یہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کہ ان دونو قوموں میں باوصف اس کے کہ صدیاں ساتھہ ساتھہ رہتے گذر گئی ہیں، لیکن پھر بھی زمین آسمان کا تفاوت ہے باعتبار مذہب تو ضد ہوئی ہی ہے، کیونکہ اگر ایک بت گر ہے تو دوسرا بت شکن۔ ایک اگر ہر سنگ راہ سے چلنے پتھر کے سامنے سر جھکا دینا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ تو دوسرا باوصف اس اعتراف کے بھی ایک خدا کا ماننے والا ہے۔ یعنی گردن شکل سے حد تک سامنے بھی خم کرلے

لیکن تمدن و معاشرت کے لحاظ سے بھی ان دونوں قوموں میں بون بعید ہے۔ اور اس
کی وجہ کھلی ہوئی ہے۔ کیونکہ ہر قوم کا مذہب اس قوم کا اصلی کیرکٹر بنانے والا ہے۔ اور
جب مذہبوں میں اختلاف ہوگا۔ تو کیرکٹر میں اختلاف کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ بہرحال وجہ
جو کچھ بھی ہو۔ کیونکہ ہم لوگ دنیا کے معاملات پر سوائے اظہار واقعات کے اور کوئی رائے زنی
کرنے کا حق نہیں رکھتے، اس اختلاف کیرکٹر کی وجہ بھی میں نے وہیں کے لوگوں سے سنکر
بیان کی ہے۔ ورنہ آپ لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ ہمارے ہاں بننے کے لیئے کسی تدریجی ارتقاء
کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے یہاں اس امر کیطرف اس لیئے ذرا اشارہ کر دیا۔ کہ اپنی جگہ پر صفحات
گذشتہ میں یہ ظاہر کرچکا ہوں۔ کہ کرہ ارض میں انسان کا بچہ جس وقت پیدا ہوتا ہے۔ تو وہ
بالکل بچہ کا [illegible] ہوتا ہے، اور اس کو تعلیم و تربیت کی ضرورت ہوتی ہے جب کہیں جا کر
جاکے برسوں میں وہ اس قابل ہوتا ہے۔ کہ کچھ سمجھ بوجھ سکے۔ برخلاف ہمارے ملک مریخ
کے۔ کہ یہاں طفلی شباب و شیب کا کوئی مفہوم نہیں ہے، اور شروع سے آخر تک وہ ایک
ہی عمر میں اپنی زندگی کاٹ دیتا ہے۔ بہرحال جو سبب بھی ہو، ان دونو قوموں کے طبائع میں
بہت مخالفت ہے۔ ایک اگر قوم پرست ہے۔ تو دوسری [illegible] تھی۔ اگر ایک لاپرواہ فضول خرچ
ہے۔ تو دوسری ویسی ہی کفایت شعار ہے، اگر ایک جری زیادہ ہے۔ تو دوسری اتنی ہی مدبر
ہے۔ اور اس لیئے ان دونوں میں باہم اتفاق کا ہونا بہت مشکل نظر آتا ہے لیکن بغیر دونو
قوموں کے اتفاق کے [illegible] ممکن نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ خیال جو اس بت
پرست قوم کو پیدا ہوا [illegible] اس کا احساس اسوقت تک دوسری بت شکن قوم کو بالکل نہیں تھا
کیونکہ [illegible] ہر چند ملک ہند کی سلطنت ہمارے
ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ لیکن دنیا میں ابھی ہمارے قوم و مذہب کی خود مختار سلطنتیں باقی ہیں، اور
اس کا ایک سبب یہ بھی [illegible] کی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ قوم تعلیم یافتہ زیادہ
نہ تھی۔ اور [illegible]

نشوونما پارہا تھا۔ ایک شخص ایسا تھا جس نے اپنی جاہل قوم کو تعلیم کیطرف رغبت دلائی
لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اس نے یہ بھی درس دینا شروع کیا۔ کہ جہانتک ممکن ہو۔ اس
غیر قوم کی سلطنت کا ساتھ دو۔ کیونکہ اس میں فوز و فلاح ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے۔ کہ اس کا
اس درس سے کیا مطلب تھا۔ گر بعض لوگ دنیا کے کہتے ہیں۔ کہ یہ صرف اس کی حکمت تھی
ورنہ اس کا نصب العین بھی وہی تھا۔ جو اسی پہلی قوم کا تھا۔ بہر حال حقیقت جو کچھ بھی ہو،
اس میں کلام نہیں۔ کہ وہ بڑی دقتوں اور مشکلوں کے بعد آخر کار اپنی قوم کو تعلیم کیطرف
متوجہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اسی زمانہ میں جب پہلی قوم کے جذبات ناقابل ضبط
ہو گئے۔ تو اس نے اپنی ایک جماعت قائم کی اور اس کا اصل مدعا یہ قرار دیا گیا۔ کہ سلطنت
موجودہ سے اپنے حقوق کا مطالبہ کیا جائے۔ یہانتک کہ اس نے اس بات پر اصرار کیا
جائے۔ کہ ملک کا انتظام خاص ملک والوں کے ہاتھ میں دیدیا جائے۔ اور خود ہاتھ پاؤں توڑ
کر بیٹھ جائے۔ دوسری قوم نے اس جماعت کے مقاصد سے اختلاف کیا۔ جو وہاں کی سلطنت
کا عین منشا تھا۔ اور کہا۔ کہ جب ہمیں اس سلطنت میں راحت و امن حاصل ہے۔ تو
کوئی وجہ نہیں۔ کہ ہم اپنے ہاتھ سے انتظام کرنے کی تکلیف گوارا کریں۔ اسی اختلاف حالت
میں عرصہ تک تو ہندوستان کا ملک اپنی ایک سطح پر [illegible]۔ لیکن اس [illegible] پرست قوم نے
یہ دیکھ کر۔ کہ جب دوسری قوم ہماری ہمنوا نہیں ہوتی۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کو بھی تکلیف
نہ پہنچائی جائے۔ طرح طرح سے ستانا شروع کیا۔ کہیں اس بات پر جھگڑا کیا۔ کہ اس نے
گائے کیوں ذبح کی کہیں ان کے مکان کے سامنے سے [illegible] [illegible] ان کے [illegible]
پر لگوا دی۔ اس قوم کا اگر کوئی [illegible]
یہ قوم چھیڑ کرتی رہی۔ یہانتک کہ دوسری قوم کو بھی اس کی ضرورت [illegible] محسوس ہوئی۔ کہ وہ اپنی
ایک جماعت الگ قائم کرے اور اپنے حقوق کا [illegible] سلطنت [illegible] طرح کرے
کہ یہ ناگوار [illegible] نہ آئیں۔ ہم ٹھیک ٹھیک نہیں کہہ سکتے۔ کہ اس مقصد میں کہانتک

کامیابی حاصل ہوئی۔ کیونکہ سوائے شکایت کے کہیں شکر کے الفاظ اس جماعت کے ریکارڈ
میں نہیں پائے جاتے۔ اسی زمانہ میں سلطنت حکمران کا ایک ناظم اعلیٰ آیا جس نے ملک
کے مشرقی حصہ کے دو ٹکڑے کر دیئے، اور اسطرح ملک کی مالگزاری بڑھا دی۔ اس کا اثر
وہاں کی قوم پر ایسا خراب پڑا۔ کہ اس نے اپنی حرکات سے سلطنت کو یہ یقین دلا دیا
کہ اگر کبھی ضرورت ہوگی۔ تو وہ اپنی ساری قوت اس کے خلاف استعمال کرنے میں دریغ
نہ کرینگے۔ یہ وقت سلطنت کے لیئے ذرا تشویشناک تہا۔ اس لیئے اس نے اس خیال
سے کہ کہیں دوسری قوم بہی اس قوم سے نہ مل جائے، مغرب کے ایک بڑے دولتمند
معزز رہنے والے کو جو دوسری قوم کا رہبر اور سردار تہا۔ اپنی طرف کر لیا۔ اور اس کو
یہ ہدایت کی۔ کہ جہاں تک ممکن ہو، وہ اپنے قوم کا خیال دوسری طرف ہٹائے رکھے۔ اور
مشرق والوں سے نہ ملنے دے، اس معزز شخص نے جسپر اس کی قوم جان دیتی تہی۔ اسی وقت
یہ ترکیب کی۔ کہ اپنی ساری قوم کی توجہ اس درسگاہ کیطرف مبذول کرادی۔ جو اس کے
رہبر اولین کی قایم کی ہوئی تہی۔ اور کہا۔ کہ تم لوگ اگر ایک معقول رقم جمع کر لو۔ تو یہ درسگاہ
بہت وسیع ہو کر سلطنت کی منظوری سے دار العلوم بن سکتی ہے۔ یہ خیال ایسا دل خوش کن
تہا۔ کہ قوم کا ہر متنفس اسی طرف متوجہ ہو گیا۔ اور چند دنوں میں وہ روپیہ جمع ہو گیا
لیکن جب وہ رقم فراہم ہو گئی تو سلطنت نے اس طرح کا دار العلوم بنانے سے انکار کر دیا
جیسی اس قوم کے افراد کی خواہش تہی۔ سلطنت کا یہ فعل ایسا تہا جس کو بہت لوگوں
نے محسوس کیا اور ان کے دلوں میں ایک خفیہ برہمی پیدا ہو گئی۔ اتفاق وقت اس کے تہوڑے
ہی دن بعد ایک دوسرے ملک میں جہاں کی رہنے والی سلطنت ہند بہی تہی۔ لڑائی چہڑ گئی
اور ہندوستان کے اس دار العلوم والی قوم کے ہم مذہب سلطنت کے ساتہہ بہت زیادتی
کی گئی ہر چند زیادتی کرنے والی قوم وہ نہ تہی۔ جو سلطنت ہند کی مالک تہی۔ مگر اس کی ہم
مذہب ضرور تہی۔ اس لڑائی کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ہندوستان کی ایک قوم میں مذہبیت یا قومیت

کا احساس پیدا ہونے کا مواد پوری طرح فراہم ہوگیا۔ اور ملک کے چند افراد نے جو اسی قوم کے بعض پر جوش افراد کے ہاتھوں میں تھے اس موقعہ سے فائدہ اٹھاکر اپنی قوم کو آخر کار اس بات پر راضی کرلیا۔ کہ اپنی جماعت کی غرض مشترک بھی وہ ہی قرار دیں جو دوسری قوم نے قرار دی ہے، اور سلطنت موجودہ سے وہ بھی یہی مطالبہ کریں، کہ "ملک کا انتظام ملک والوں کے ہاتھ میں دیدیا جائے" لیکن جہاں یہ اخبارات اس بات پر زور دے رہے تھے، وہیں ایک جماعت ایسی بھی تھی۔ جو اس کی مخالف تھی۔ اور اس کا خیال تھا۔ کہ اس نوع کا انتظام ہماری قوم کے لیئے کبھی مفید ثابت نہیں ہوسکتا۔ سلطنت موجودہ اس بات سے کبھی انکار نہ کرتی تھی۔ کہ وہ ملک کا انتظام ملک والوں کے سپرد نہ کرے گی۔ بلکہ وہ اس پر تیار تھی۔ بشرطیکہ اسے اس بات کا یقین دلادیا جائے۔ کہ ملک والے اس قابل ہوگئے ہیں

جب دونوں قوموں کی خواہشیں اس معاملہ میں متحد ہوگئیں۔ تو ان کے بعض دانشمند لوگوں کو فطرتاً یہ آرزو پیدا ہوئی۔ کہ وہ آپس میں ہر طرح مل جائیں اور قوت متحدہ سے کام نکالیں۔ لیکن اختلاف مذہب کی جو خلش دونوں کے دلوں میں کھٹک رہی تھی۔ وہ آزادی اور اطمینان کے ساتھ اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی۔ کہ یوں آپس میں میل کرلیا جائے کیونکہ باوصف ان تمام دعاوی اتحاد کے اسی زمانہ میں اور بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں ایسی ہوگئیں جن سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ تخالف ابھی باقی ہے، اور ایک دوسرے کے درپے آزار ہے۔

اسی زمانہ میں ہند کی سلطنت کو خود اپنے اصلی ملک میں ایک دوسری زبردست سلطنت سے مقابلہ کرنا پڑا۔ اور اس میں اس کو بہت زمانہ لگ گیا۔ ہندوستان کی دونوں قومیں اس وقت کچھ نہ کرسکتی تھیں۔ کیونکہ ایسے نازک وقت میں سلطنت کو اپنی طرف متوجہ کرنا مناسب نہ تھا۔ مدت کے بعد جب جنگ کا خاتمہ ہوگیا۔ اور سلطنت ہند کو امن و اطمینان نصیب ہوا۔ تو اس امر کے اعتراف میں کہ جنگ کی جیت

یاں دونو قوموں نے کافی مدد دی۔ اور خاموش زندگی بسر کرنے کی کوشش کی ان دونو کو الگ الگ اپنا دارالعلوم بنانے کی اجازت دیدی، اور انہیں شرائط کے ساتھ جن شرائط کے ساتھ وہ طلب کرتی تھیں۔ ہر چند سلطنت کے اس لطف وکرم کو ان قوموں نے نہایت شکرگذاری کے ساتھ قبول کرلیا۔ لیکن اسی کے ساتھ ان کی وہ خواہش جس میں وہ دونو مشترک تھیں۔ اور قوی ہوگئیں۔ اور چند سال کے بعد ہی علانیہ اس کا مطالبہ شروع کردیا گیا۔ اگرچہ سلطنت نے اس خیال کے تمام حامی اخبارات بند کرادیئے تھے۔ اور کوئی دقیقہ اس کے سدباب کے لیے نہیں اٹھا رکھا گیا۔ لیکن یہ خیال اور زیادہ مستحکم ہوگیا۔ اور ملک بھر کی ایک عام آواز یہی تھی کہ سلف گورنمنٹ ملنا چاہیئے (اب غالباً آپ لوگ کچھ کچھ سمجھنے لگے ہوں گے۔ کہ سلف گورنمنٹ کا کیا مفہوم ہے) اس شور وشغب کا فوری نتیجہ یہ ہوا، کہ مجالس انتظامیہ میں دونو قوموں کے سربرآوردہ حضرات کو بہ نسبت قبل کے ذرا زیادہ تعداد میں شریک ہونے کی اجازت دیدی گئی۔ مگر اس رعایت سے وہ لوگ کچھ خوش نہ تھے کیونکہ ان کو اب بھی یہی شکایت تھی۔ کہ ہماری کوئی نہیں سنتا۔ اور مجلس انتظامیہ میں چونکہ خاص سلطنت کے اراکین کی تعداد زیادہ ہوتی ہے، اس لیے کثرت رائے ہمیشہ انہیں کیطرف ہوتی ہے اور ملک والوں کو سوائے اس کے اور کچھ نصیب نہیں ہوتا۔ کہ وہ دو دو گھنٹے تک کھڑے ہو کر چیخا کریں۔ اور بے کار اپنا گلا خشک کیا کریں (سنا جاتا ہے کہ اس شکایت پر سلطنت کو ہنسی آگئی۔ اور شاید کچھ رحم بھی آیا ہو۔ کیونکہ ان کو اجازت دیدی گئی۔ کہ وہ دوران تقریر میں جتنی دفعہ جی چاہے پانی یا چاء پی سکتے ہیں) کچھ سال بعد سلطنت ہند کو بعض مشرق کی دوسری سلطنتوں سے برسرپیکار ہونا پڑا، اور اس میں ایسی کامیابی اس کو حاصل ہوئی کہ ہندوستان سے بہت زیادہ وسیع وزرخیز ممالک اس کے ہاتھ آگئے۔ اور یہ کامیابی گو فاتح قوم کے لیئے باعث مسرت تھی۔ مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ اس کی جیسی سچی خوشی ہند کی

قوموں کو ہوئی کسی اور کو نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ اس وسعت ملک گیری کا اثر یہ ہوا کہ بوجہ قرب ہندوستان سوائے اس کے اور کوئی صورت نئے مفتوحہ ممالک پر اقتدار قائم رکھنے کی نظر نہیں آئی کہ ہندوستان کو سلف گورمنٹ دیدیجائے اور کچھ شرائط ایسے کر لیئے جائیں۔ جو سلطنت کے اقتدار کو بھی بدستور قائم رکھیں

چنانچہ ۱۹۴۵ء مطابق ۱۳۲۴ جلالی وہ خاص سال تھا جس کی عرصہ سے تمنا کی جا رہی تھی۔ کیونکہ پہلا اعلان منجانب سلطنت اس مضمون کا شایع کیا گیا۔ کہ سال اخیر میں ملک والوں کو سلف گورمنٹ چند شرائط مخصوصہ پر دیدی جائے گی، تمام صوبہ جات کے قایم مقام جمع ہوں، اور بعد رد و قدح اس کا فیصلہ کریں۔ کہ آیا وہ شرائط معلومہ پر سلف گورمنٹ لینے کے لیئے تیار ہیں یا نہیں،

اس اعلان نے ایک عجیب مسرت ملک میں پھیلا دی اور ہر طرف سے سلطنت کے پاس شکریہ کے تار آنے شروع ہو گئے۔ گر اب وقت بے کار بیٹھنے کا نہ تھا۔ کیونکہ اصل کوشش کی گھڑی یہی تھی۔ اور وہ چال جو بہت عرصہ پہلے ہند کی اصلی قوم نے سوچ رکھی تھی۔ اب چلی جانے والی تھی۔

یہاں یہ ذکر غالباً بے محل نہ ہوگا۔ کہ جب ہند کی دوسری قوم بھی سلف گورمنٹ کی خواہشگار ہوئی۔ تو اس کے ارادوں میں استحکام اور اپنی آواز میں انکی معیت کیوجہ سے ایک قوت پیدا کرنے کیلیئے یہ بات سمجھا دی گئی کہ "ہر چند تمہاری آبادی نسبتاً بہت کم ہے، لیکن اس امر کی ضمانت کے لیے کہ تمہارے حقوق کا مساویانہ انداز سے تصفیہ ہوگا ہم اس بات کا وعدہ کرتے ہیں۔ کہ سلف گورمنٹ ملنے کیصورت میں تمہاری تین چوتھائی تعداد ہماری پوری تعداد کا مقابلہ کرے گی۔ یا پھر ہماری تمہاری تعداد مجالس انتظامیہ میں برابر رہے گی اور صدر کا انتخاب بھی انہی اصول پر ہوگا۔" یہ ایک ایسا وعدہ تھا جسپر اعتماد کرنے کے بعد کوئی خلش دوسری قوم کو باقی نہیں رہ سکتی تھی۔ لیکن اب جبکہ صحیح وقت

کا کام آیا۔ اور سیلف گورنمنٹ کے ملنے کی آرزو پوری ہونے کے قریب آئی تو ایک خفیہ جلسہ اس قوم نے اپنا کیا۔ اور نہایت غور و فکر کے بعد دوسری قوم کے معزز افراد کو دعوت دی گئی۔ کہ وہ تمام امور پر غور کرنے کے لیے جمع ہوں۔ یہ لوگ جمع ہوئے اور نہایت تپاک اور خاطر مدارات سے ہاتھوں ہاتھ لیے گئے (اس دوسری قوم کے منجملہ دوسری خصوصیات کے یہ بھی ایک خصوصیت ہے کہ جہاں اس سے فوراً اظہار عجز کیا گیا۔ اور ضرورت سے زیادہ عزت کی گئی۔ بس پھر وہ بلا پس و پیش اپنے تئیں بلجاجت و خوشامد کے ہاتھوں میں سپرد کر دیتی ہے، اور اپنے برے بھلے کی تمیز نہیں کر سکتی) ایک ہفتہ تک یہ مجلس قایم رہی اور آخر کار اس احمق قوم کو یہ اچھی طرح سمجھا دیا گیا۔ کہ "وہ وعدہ جو ہم نے متعلق لحاظ تعداد کیا ہے، ہر طرح مستحکم ہے۔ لیکن قبل سلف گورنمنٹ ملجانے کے اس کا اعلان سلطنت کے سامنے کرنا حارج ہوگا۔ کیونکہ پھر اس صورت میں سلطنت کو دونو قوموں کے باہمی اتفاق کا پورا یقین آ جائے گا۔ اور کبھی اس یقین کی حالت میں سلف گورنمنٹ نہیں دیجا سکتی۔ کیونکہ فی الحال سلف گورنمنٹ کا دیا جانا۔ اسی یقین کی بنا پر ہے۔ کہ بوجہ کثرت و قلت (عدم توازن) دونو قومیں ضرور اختلاف کریں گی۔ اور پھر سلطنت کو ایک بہانہ ہاتھ آ جائے گا۔ اور وہ سلف گورنمنٹ نہ دے گی۔ اس لیے مصلحت اس امر کی مقتضی ہے کہ اس کی ہوا تک سلطنت کو نہ دیجائے، بلکہ اس کے سامنے یہی کہا جائے، کہ مجلس انتظامیہ کے ممبروں کا انتخاب دونو قوموں سے بلحاظ کثرت و قلت آبادی ہوگا، پھر بعد کو جب انتظام اپنے ہاتھ میں آ جائے گا۔ تو اس کی ترمیم آسانی سے کر دی جائیگی اور وہ وعدہ جو پہلے کیا گیا ہے۔ بغیر کسی تغیر و تبدل کے پورا کیا جائے گا" کچھ تو خاطر مدارات کا اثر، اور کچھ یہ بات کہ یہ صلاح بھی بہت ٹھکانے کی بظاہر میں معلوم ہوتی تھی الغرض یہ لوگ راضی ہو گئے اور اپنی قوم کو بھی ان تمام مصالح کا ذکر کر کے اس بات پر آمادہ کر لیا۔ کہ وہ اس معاملہ میں کسی قسم کی مخالفت کا اظہار نہ کرینگے۔ اور فی الحال جس طرح ہو،

سلف گورنمنٹ کو لینا ہی غنیمت جانیں گے ۱۹۴۶ء آہستہ آہستہ گذرتا گیا۔ اور آخر کار وہ دن آگیا۔ جب کئی قوموں کی قسمتوں کا فیصلہ ہونا تھا،

اس مجلس میں جو کچھ رد و قدح ہوا ہو۔ جو بحث مباحثہ ہوا ہو۔ اس کا ذکر فضول ہے۔ کیونکہ اصل چیز دیکھنے کی نتیجہ ہے اور اس کا اظہار انعقاد جلسہ کی شام کو ان الفاظ میں کر دیا گیا کہ

"پبلک ہندوستان کو بدولت ملک معظم سلف گورنمنٹ عطا فرماتے ہیں جو ایک سو ممبران پر مشتمل ہوگی۔ ان ممبران میں سے ایک ثلث ممبر اس قوم کے ہونگے۔ جو قوم حکمراں ہے اور باقی۔ تعداد کا انتخاب ہندوستان کی دو نو قوموں میں سے باعتبار نسبت آبادی ہوگا۔ لیکن اس کا پریسیڈنٹ (صدر) ہر حال میں حکمراں پارٹی کا ہوگا"

ہر چند اس امر کی بے انتہا کوشش کی گئی کہ حکمراں جماعت کا کوئی ممبر نہ ہو اور اگر ممبر ہو تو کم از کم صدر اس قوم کا نہ ہو۔ لیکن اس موقعہ پر اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کے بعد ممبران کا انتخاب عمل میں آیا۔ اور بہت جلد یہ بھی طے ہو گیا۔ چونکہ ہندوستان کی قدیم رہنے والی قوم بہت زیادہ تعداد میں ہے، اس لیئے قریب پچاس کے ممبر اس قوم سے منتخب ہوئے اور دوسری قوم سے صرف بیس۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ تمام معاملات پر وہ قوم حاوی ہو گئی، اور چند دن میں اس نے ثابت کر دیا۔ کہ ان میں کوئی فرد ایسا نہیں ہے جس کی تائید میں ساری قوم کی قوم نہ اٹھ کھڑی ہو،

سلف گورنمنٹ ملنے کے پہلے ہی سال مجلس انتظامیہ میں یہ مسئلہ پیش کیا گیا۔ کہ چونکہ اصل زبان اس ملک کی وہ نہیں ہے۔ جو یہاں رائج ہے، اس لیئے ملک کا حق ہے۔ کہ اس زبان کو رواج دے جو اب مفقود ہوتی جاتی ہے۔ اور ضرورت ہے کہ تمام کاغذات حکومت اور کارروائی عدالت اسی زبان میں ہو (یہاں یہ امر ظاہر کر دینا مناسب ہوگا۔ کہ باعتبار زبان کے تو ملک میں کوئی مخالفت نہیں ہے۔ لیکن بہ حیثیت انداز تحریر کے ہندو یہ کہا جاتا کہ

ہے۔ کہ اس قوم کا اصل خط وہ نہیں تھا۔ جو دوسری قوم میں رائج تھا۔ اور اس قوم کی حکومت کے زمانہ میں رواج پا گیا تھا۔ یہ پہلا موقعہ تھا۔ کہ دوسری قوم کو اس سلف گورنمنٹ کی برکات کیطرف سے کچھہ بے اعتقاد ہونے کیوجہ سمجھہ میں آئی ہو۔ کیونکہ اس کو اس سے قبل یہ بالکل یقین تھا۔ کہ انکی طرف سے کوئی بات ایسی نہ اٹھائی جائے گی جو ان کے جذبات وحیات کے خلاف ہو۔ مگر اب سوچنے کا وقت نکل گیا تھا۔ اور حریف بازی لے گیا تھا۔ اس نے اس مسئلہ پر نہایت زور وشور سے تقریریں کیں۔ اور حکمران قوم کے بعض ممبروں نے بھی اس کی تائید کی۔ کیونکہ ان کے نزدیک بھی اس خط کا رواج دینا اسوجہ سے زیادہ مناسب معلوم ہوا کہ اول تو اس کی تحریر میں ان کی زبان کی تحریر کی بھی کچھہ شان پائی جاتی تھی۔ اور دوسرے یہ کہ تحریر مروجہ میں باوصف مشق بسیار وہ کامیابی نہیں حاصل کر سکے تھے۔ الغرض یہ مسئلہ پیش ہوا۔ اور کثرت رائے کیوجہ سے پاس ہو گیا۔ اب مدارس میں یہ خط لازمی کر دیا گیا۔ اور نہایت عجلت کے ساتھہ مختلف علوم وفنون کی کتابیں اس زبان میں منتقل ہونے لگیں اس سال کے دوسرے جلسہ میں ملازمین کا مسئلہ پیش کیا گیا۔ اور اس بات پر زور دیا گیا۔ کہ ہر محکمہ میں ملازمین کی تعداد بھی اسی حساب سے رکھی جائے۔ جس حساب سے بلحاظ آبادی انتخاب ممبران ہوا ہے۔ چونکہ دوسری قوم نے بروقت انتخاب ممبران اپنے سکوت سے اس معاملہ پر رضامندی کا اظہار کیا تھا۔ اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ اس موقعہ پر ان کی چیخ پکار سنی جاتی۔ یہ مسئلہ بھی پیش کیا گیا۔ اور اس قوم کے جتنے زیادہ ملازم تھے۔ سب برطرف کئے جانے لگے۔ تیسرا قانون جس نے اور بھی رہی سہی عزت اس غریب قوم کی خاک میں ملادی یہ مسئلہ مقابلہ تھا۔ کہ کوئی وہ عہدہ جس میں انتظامی اختیارات عطا کئے جائیں نہیں دیا جا سکتا۔ تا وقتیکہ امتحان مقابلہ میں کامیابی حاصل نہ کی جائے۔ چونکہ یہ قوم تعلیم میں اس قوم سے بہت پیچھے تھی۔ اور باوصف جدوجہد وہ ایک صدی کی کمی کو چند سالوں میں پورا نہیں کر سکتی تھی اس لیے اس تعداد میں بھی کمی ہو گئی جو از روئے آبادی ہونا چاہیئے تھی۔ یہ چند باتیں

ایسی پے در پے ہوئیں۔ کہ جن سے دوسری قوم نے علی الاعلان اس بات کو محسوس کرلیا۔ کہ ہمیں سخت دہوکا دیا گیا۔ اور وہ قوم کبھی ہمارا ساتھہ نہیں دے سکتی۔ یہانتک تو صرف انتظامی معاملات تھے۔ لیکن مجھے یہ دیکھہ کر کیسی حیرت ہوئی۔ کہ اس سال جو میں وہاں گیا۔ تو بعض شاندار جانوروں کی ایسی کثرت تھی۔ کہ انکی وجہ سے بازار کا چلنا پہرنا مشکل ہو گیا تہا (میں نے اسوقت بہی اس ملک کی سیاحت کی تھی۔ جب سلف گورنمنٹ کا بہوت ملک پر سوار نہ تہا۔ لیکن اسوقت یہ عجیب وغریب بات دیکھنے میں نہیں آئی تھی) اسکی وجہ یہ معلوم ہوئی۔ کہ ان جانوروں کا ذبح ہونا بند ہو گیا ہے۔ کیونکہ ان کے مارے جانے سے اس قوم کے مذہبی احساسات کو صدمہ پہنچتا ہے۔ اسی طرح ان کے ذبح نہ کرنے سے دوسری قوم کے مذہبی احساسات کو تکلیف ہوتی ہے۔ مگر یہ کثرت رائی کی بلا ایسی ہی طرح مسلط تھی کہ دوسری قوم کسی معاملہ میں پہر کامیاب نہیں ہو سکتی تھی الغرض اس سلف گورنمنٹ نے ہندستان کی ایک قوم کو بنا دیا اور دوسری قوم کو بالکل تباہ کر دیا نہ عمدہ ملازمتیں انکے پاس ہیں۔ نہ تجارت ان کے ہاتھہ میں ہے۔ ملک کیطرف سے جو سرکاری مدارس مختلف علوم وفنون کے جاری کئے گئے ہیں ان میں بہی قلت وکثرت آبادی کا لحاظ رکھا جاتا ہے اور ہر قوم کے اسیقدر طلبا داخل کئے جاتے ہیں۔ جتنے ازروے حساب ہونے چاہئیں

جب چند سال اسی طرح گذر گئے اور کوئی تدبیر اس سے چھوٹنے کی نظر نہ آئی، تو سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نظر نہ آیا۔ کہ ہر حال میں غالب قوم کا ساتھہ دیا جائے چنانچہ دوسری قوم کے اکثر ممبروں نے یہ وتیرہ اختیار کر لیا۔ کہ ہر بات میں اپنے مخالفوں کا ساتھہ دیں۔ اور انہیں کے خیالات کے ساتھہ ساتھہ اپنے اغراض ومقاصد کو وابستہ کر دیں۔ ہر چند یہ انکی خودغرضی تھی۔ ان کا ضمیر ضرور انہیں ملامت کرتا تہا۔ لیکن انہوں نے اس خیال سے کہ جب مخالفت کرنے سے قوم کا بہلا نہیں ہو سکتا۔ تو ان کا ساتھہ دے کے کیوں نہ ذاتی اغراض میں کامیابی حاصل کیجائے۔ لیکن زمانہ نے انہیں بہہ

بات بہت جلد ثابت کر دی۔ کہ قوم کی قوم سے نفرت کرنے والا اس قوم کے بعض افراد پر بھی کبھی لطف نہیں کر سکتا۔ انہوں نے خوشامدیں کیں، لجاجت و منت سے کام لیا لیکن اس قوم نے جو بہت زیادہ زیرک تھی۔ ان کو ٹھکرا دیا۔ اور کہدیا۔ کہ کیا تم اپنے ہی ہاں کا وہ مقولہ بھول گئے کہ "دنیا مکر ہے اور بغیر مکر کے حاصل نہیں ہو سکتی" ہمنے مکر کیا۔ اور اس مکر کے ذریعہ سے تم کو مغلوب کر لیا۔ لیکن یہ یاد رکھو۔ کہ ہم تمہارے مکر میں کبھی نہ آئیں گے اور اس دنیا کو کبھی تمہارے پاس نہیں جانے دینگے جس کو ہم نے اتنی تمناؤں۔ اتنی آرزوؤں، اور اتنی قربانیوں کے بعد حاصل کیا ہے۔ اور یہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ تمہیں کیا حق حاصل ہے۔ کہ ہمارے ملک میں کسی ترقی کی آرزو رکھو۔ ہم یہ نہیں کہتے۔ کہ تم نکل جاؤ (حرچند ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں) رہو، لیکن اسی طرح رہو جس طرح ایک اجنبی، اک غیر رہتا ہے، اپنی تمناؤں کو مختصر کرو۔ اپنی آرزوؤں کو محدود بناؤ اپنے حوصلوں کی بلندی کو پست کرو۔ اور رہو جسطرح ہم تمہیں رکھنا چاہیں۔ ہم کو تمہاری خون آشام داستانیں یاد ہیں ہم کو معلوم ہے کہ تم نے کس طرح ہمارے یہاں کے مقدس بتوں کو برباد کیا ہم جانتے ہیں۔ کہ تم لفظ "ہندو" کے معنی غلام کیا کرتے ہو، ہم اس سے بیخبر نہیں ہیں کہ تمہارے بزرگوں نے ہمارے مذہب کے استیصال میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا، پھر کیا تمہاری سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ وہ قوم جو تم سے اتنا دیرینہ بغض رکھتی ہو، تمہارے ہاتھوں سے اس قدر تکلیفیں پہنچی ہوں، کبھی اس بات پر راضی ہو سکتی ہے کہ تمکو وہ رعایتیں دے جسکے تم کبھی مستحق نہیں تھے، تمہارے ساتھ وہ سلوک کرے جو تم نے کبھی اس کے ساتھ نہیں کئے۔ ہم ہنستے تھے، جب اک زمانہ میں تمہارے بعض لیڈر ہمارے ساتھ رفق و اتحاد کا درس دیتے تھے (ہم بھی ہاں میں ہاں ملاتے تھے صرف اس لئے کہ ہمیں تمہاری اس بیوقوفی سے بڑا کام نکالنا تھا۔ ہم کو تمہارے ہی ہاتھ سے ہلاک کرنا تھا) حالانکہ ان کو یہ سمجھنا چاہئے تھا کہ شرق و غرب اکٹھے ہو سکتے ہیں، شمال جنوب سے مل سکتا ہے۔ لیکن یہ کسی طرح ممکن نہیں۔ کہ اسلام اور ہندویت ایک جگہ جمع ہو سکیں،

دوسرا صفحہ

یہ روزنامہ یا میری داستان سیاحت ہرگز مکمل نہیں کہی جاسکتی۔ اگر میں ہندوستان کی تعلیمی حالت پر روشنی نہ ڈالوں ہرچند مجھے اپنے برادران ملک کے سمجھانے میں بہت دقت ہوگی۔ اور میں حیران ہوں۔ کہ کن الفاظ میں ان مشاہدات وتجربات کا ذکر کروں، کہ میرے احباب حقیقت حال سے آگاہ ہو جائیں۔ لیکن بہر حال میرے لیئے یہ ذکر ناگزیر ہے۔ اور بلالحاظ اس کے کہ میں کس حد تک ادائے مطالب میں کامیاب ہوں گا۔ اس عجیب وغریب داستان کو شروع کرتا ہوں۔ میں پہلے یہ عرض کرچکا ہوں۔ کہ ہندوستان میں دو قومیں مختلف الخیال اور مختلف المذہب رہتی ہیں۔ اوران دونو قوموں کے جذبات و داعیات وخواہشات و آمال ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں۔ کہ اگر میں کسیکو سمجھانے کی غرض سے ان کو سیاہ وسپید شیرینی وتلخی نشیب وفراز ہا نہیں سے تعبیر کروں غلطی نہ کروں گا۔ میں اس کے ساتھہ یہ بھی ظاہر کرچکا ہوں۔ کہ ان دونو قوموں پر حکومت کرنے والی ایک تیسری قوم ہے۔ جو نہ ان کے مذاق کی ہے نہ ان کے ملک کی ہے۔ اور جس کے خصائص و امیال ان دو نو سے علیحدہ ہیں۔ غالبًا ملک مریخ کے رہنے والوں کے لیئے یہ عجیب وغریب خبر ہوگی۔ کہ کسی ملک پر حکومت کرنے والا اسی ملک کا نہ ہو، بلکہ کسی دوسرے ملک سے متعلق ہو۔ لیکن وہ یقین کریں۔ کہ ہندوستان کا یہی حال ہے۔ اور شاید خدا کا یہ انتظام مناسب ہے ورنہ ایسے ملک کا نظم ونسق دشوار ہوجاتے میں پہلے برادران ملک پر یہ ظاہر کرچکا ہوں۔ کہ وہاں بہت جد وجہد کے بعد سلف گورمنٹ قائم ہوگئی ہے، اور میں اس سیلف گورمنٹ کی پوری تعریف اور اس کے نتائج کو بھی بتلاچکا ہوں۔ کہ ایک قوم جس کو ہندوستان کی قدیم قوم ہونے کا فخر حاصل ہے بہت ترقی کرگئی ہے۔ اور دوسری قوم جو یہاں کسی زمانہ بعید میں فاتح کی حیثیت سے آئی تھی، سخت انحطاط کی حالت میں ہے۔ یہانتک کہ اس کی عظمت بھی روایات بھی بالکل

مٹ گئی ہیں۔ اور وہ ایک ایسے ادنیٰ طبقہ میں شمار کی جاتی ہے۔ جس کے احساسات کی رعایت قانون ملکی میں ضروری خیال نہیں کی جاتی۔ اس کی وجہ ایک تو میں مسئلہ سلف گورنمنٹ کے بیان میں ظاہر کر چکا ہوں۔ کہ قبل سلف گورنمنٹ کی خواہش کرنے کے اس قوم نے یہ نہیں دیکھا۔ کہ دوسری قوم جس کو اس سے ہمیشہ سے بغض و عنا د چلا آتا ہے، اپنی کثرت آبادی کے لحاظ سے کسقدر غالب آجائے گی۔ اور پھر وہ کسی ایسے ایثار کی قدر نہ کرے گی جو وقت پر سخت فریب دے کر حاصل کیا گیا تھا۔ اور دوسری وجہ اس قوم کا نظام تعلیم تھا۔ میں لفظ نظام سے تعبیر کرتا ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ اس میں کبھی کوئی نظام قائم نہ ہوا تھا۔ اور تماشہ یہ ہے کہ اس قوم کے سربرآوردہ لوگوں نے ہمیشہ اس کو نظام ہی کہہ کہہ کر قوم کو دھوکا دیا۔ اور آخر کار اسے کہیں کا نہ رکھا، اس کو سمجھانے کے لیئے بھی مجھے تاریخ کے بہت سے اوراق لوٹنے پڑیں گے، ورنہ میرا ملک ہرگز نہیں سمجھ سکتا کہ کبھی تعلیم بھی کسی قوم کو تباہ کر سکتی ہے۔ مگر سب سے پہلے یہ جان لینا چاہیئے۔ کہ ہندو میں تعلیم کے معنی صرف سکھانے اور بتلانے کے ہیں۔ اور جیسا کہ ہمارے ملک میں سکھانا اور کسی کی حالت میں انقلاب صحیح پیدا کر دینا دو مترادف الفاظ ہیں۔ وہاں یہ نہیں ہے بلکہ وہاں یہ دونو چیزیں نہ صرف مختلف بلکہ ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ اور شاید اس کی معلوم کر لینے کے بعد اصل بحث سمجھنے میں زیادہ مدد ملے گی جس وقت تک یہ تیسری قوم یہاں آکر حکمران نہ ہوئی تھی اسوقت تک اسی قوم کی ہندوستان میں حکومت تھی۔ اور ان میں علوم کا چرچا تھا۔ جو یہ اپنے ساتھ شمال سے لائی تھی۔ اسوقت تک زمانہ ترقی کر گیا تھا یا نہیں۔ یہ دوسری بحث ہے، لیکن یہ یقینی ہے۔ کہ ہندوستان کو اس بات کا علم ہی نہیں تھا۔ کہ یہاں سے باہر کیا ہو رہا ہے۔ یا کبھی تیسری قوم ان پر حکومت کرنے باہر سے آئیگی، اس حکومت کی تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حکومت ایک نوع کی مذہبی حکومت تھی۔ اس میں تعلیم صرف اسی حد تک رائج تھی جس حد تک مذہب

میں رسوخ اور مذہبیت میں استحکام قایم رکھنے کے لیئے ضروری ہو۔ اور اس میں کلام نہیں کہ کہ اس پہلو سے ان کی حکومت ایک مکمل حکومت تھی جس میں تنزل ممکن نہ تھا، اگر وہی اصول قایم رہتے، اور ہندوستان کی آب وہوا کی وہ خصوصیات جو ہمیشہ قوموں کے زوال و انحطاط میں معاون ہوئی ہیں، اس حکومت پر موثر نہ ہوتیں۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ مذہبیت کم ہوتی گئی۔ وہ سادگی وہ عملی زندگی، اور وہ مستعدی جو اس قوم کا شعار تھی نابود ہوتی گئی۔ یہانتک کہ اُنکی حکومت بہت ضعیف ہوگئی۔ اور ان کا اقتدار بالکل مضمحل۔ یہ ایسا وقت تھا کہ اگر ہندوستان کی اصلی قوم میں کچھہ بھی صلاحیت ہوتی۔ تو وہ اپنی گمشدہ عزت کو واپس لے لیتی۔ مگر پہلے کی خانہ جنگیوں اور باہمی اختلاف نے اس کو اس قدر ضعیف نہ کر دیا تھا۔ کہ وہ پھر اسقدر جلد سنبھل جاتی۔ بہر حال وہ اس ضعف سے فائدہ نہ اُٹھا سکی، بلکہ خدا نے ایک تیسری قوم کو اس کمزوری سے فائدہ اُٹھانے کے لیئے بھیجدیا۔ اور یہیں سے اصل بحث شروع ہوتی ہے،

اس تیسری قوم کی حکومت کس طرح رفتہ رفتہ بڑھی اور اس کا اقتدار کس تدریج کے ساتھہ سارے ملک پر قایم ہوگیا۔ یہ ایک جداگانہ بحث ہے۔ اور اس کا ذکر کسی اور جگہ آپ دیکھیں گے، یہاں صرف یہ سمجھہ لینا چاہیئے۔ کہ اس قوم کی حکومت بجائے تلوار کے زیادہ تر فراست و دانائی سے قایم ہوئی جس کو پالیسی یا حکمت عملی کہتے ہیں۔ اور اس لیئے ظاہر ہے کہ اس کو یہاں کی قوموں پر حکومت قایم کرنے کے لیئے فوری انقلاب کے اصول کو نظر انداز کر دینا پڑا ہوگا۔ جس وقت یہ قوم برسر اقتدار ہوئی۔ تو سب سے پہلی چیز جس پر اس کی نگاہ پڑی ہندوستان کی مختلف المذاق آبادی تھی اس نے خیال کیا کہ ایسے ملک پر حکومت کرنا گو ابتداً دشوار نظر آئے۔ لیکن اصولاً نہایت آسان ہے۔ اور اس لیئے اس نے فوراً انہی اصول کے مطابق بنیاد سلطنت ڈالنے کی ابتدا شروع کر دی؛ اس قوم کی زبان بالکل مختلف تھی۔ اور ہندوستان کی مروجہ زبانوں سے وہ باعتبار ہجا وغیرہ باعتبار ترکیب الفاظ وغیرہ

متباین تھی۔ اور اس لیئے ظاہر ہے کہ یہاں کی معاشرت یہاں کی حالت اور یہاں کے تمام
طبقات و اقوام کی کیفیت معلوم کرنے کے لیئے اس کو بہت دشواریوں سے مقابلہ کرنا پڑا
ہوگا، بالکل ممکن تھا۔ کہ وہ دفعتہً اپنی زبان کو رائج کرنے کی کوشش شروع کرتی اور
یہاں کی قوموں کو مجبور کرتی کہ وہ اسے حاصل کریں۔ لیکن اس نے ایسا کرنا مناسب نہیں
بلکہ اس کے خلاف خود یہیں کی مروجہ زبان کو ترقی دینی شروع کی۔ اس سے ایک فائدہ
تو یہ ہوا۔ کہ وہ وحشت و مغائرت جو یہاں کے لوگوں کو قدرتاً ہونی چاہیئے تھی، رفتہ
رفتہ کم ہونے لگی۔ اور دوسرا فائدہ یہ ہوا۔ کہ خود اس برسر اقتدار قوم کے افراد حکومت کو
ہندوستان کی قوموں کا مطالعہ کرنے کا زیادہ موقعہ حاصل ہونے لگا۔ اور اس طرح اس
پالیسی کے کارگر ہونے کے لیئے زیادہ سہولتیں پیدا ہونے لگیں جس کی بنیاد صرف
تالیف قلوب کے یقین دلانے پر قایم کی گئی تھی،

اسی دوران میں جب یہاں کی قوموں کو معلوم ہوا۔ کہ یہ نئی حکمران قوم ہماری
حالت درست کرنے پر آمادہ ہے، اور ہم پر حکومت بجائے قوت کے محبت سے کرنا چاہتی ہے
تو ان کو از خود اس کی طرف سے خیال محبت و ہمدردی قایم ہونے لگا۔ اور اسطرح
وہ مغائرت جو زبان کیطرف سے تھی کم ہونے لگی۔ اور ان کو بھی مغرب کی زبان سیکھنے
کیطرف سے جو مخالفت تھی۔ میلان میں تبدیل ہونے لگی، اس میں کلام نہیں۔ کہ یہ
مغربی حکمران قوم شروع ہی سے اس بات کی خواہشمند تھی۔ کہ محکوم قومیں ہماری زبان
سیکھیں، اور یہ خواہش اس کی بالکل فطری تھی۔ کیونکہ اس کو ضرورت تھی یہیں کے
آدمیوں سے کام لینے کی اور جب تک وہ حکمراں زبان میں کلام کرنے کے قابل نہ ہوتے
بڑے بڑے افراد حکومت کو معاملات نظم ونسق میں آزادی کے ساتھ کام کرنے اور کام
لینے کا موقعہ حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ رہا یہ امر کہ خود اس قوم نے کیوں نہ یہاں کی زبان
میں مہارت تامہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ سو اس کا جواب ظاہر ہے کہ بہ حیثیت حکمراں

ہونے کے اس کو یہ حق حاصل تھا۔ کہ تو کسی بات پر مجبور ہونے کی جگہ وہ دوسرے کو مجبور کرے۔ لیکن جیسا کہ ہم ابھی لکھ چکے ہیں۔ اس نے کبھی مجبور نہیں کیا بلکہ رفتہ رفتہ انتظام کی بنیاد ایسی ڈالدی، کہ لوگوں کو خود مجبوراً مغربی زبان سیکھنی پڑی، اور اس کا مدعا بغیر کسی جبر و تعدی کے حاصل ہو گیا،

جب ہندوستان کی دونوں قوموں کو معلوم ہو گیا۔ کہ ان کی دنیاوی ترقی کا انحصار زیادہ تر مغربی زبان سیکھنے پر ہے تو ان میں تحریک پیدا ہوئی۔ لیکن یہ تحریک بھی دونو قوموں میں ایک ہی ساتھ پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ ان دونو میں بہت تفاوت رہا تھا۔ ہندو قوم جو اس سے قبل ہی محکوم رہ چکی تھی اور جس کے قوائے حکومت بہت زیادہ مضمحل یا فنا ہو چکے تھے اس نے سب سے پہلے اسطرف توجہ کی اور دوسری قوم نے جس کو مسلمان کہتے ہیں اور جس کی حکومت کو زائل ہوئے ابھی بہت تھوڑا زمانہ ہوا تھا۔ بہت دیر میں توجہ کی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے، کہ ہندوؤں کی خود اپنی کوئی خاص زبان تھی ہی نہیں۔ جو زبان ان میں رائج تھی وہ مسلمانوں ہی کی تھی۔ اس لئے کوئی وجہ نہ تھی۔ کہ وہ غیر زبانوں میں سے اس زبان کیطرف نہ متوجہ ہوتے۔ جو فی الحال حکمراں تھی اور جس کے حاصل کرنے سے فوائد کے حصول کی بھی توقعہ تھی ہندوؤں کی مذہبی زبان سنسکرت عرصہ ہوا فنا ہو چکی تھی۔ اور معاشرتی زبان خود دوسروں سے وام لی گئی تھی۔ اس لیئے ان کو مغربی زبان کے حصول میں ذرا پس و پیش نہ ہوا اور سب سے پہلے وہ لبیک کہتے ہوئے اس کیطرف بڑھے، برخلاف مسلمانوں کے کہ ہنوز ان میں اپنی حکومت کی یاد باقی تھی اور وہ اس کو عار جانتے تھے۔ کہ اس قدر جلد دوسری قوم کی زبان کے سامنے سر عجز خم کر دیں علاوہ اس کے خود انکی مذہبی زبان زندہ تھی۔ اور چونکہ مذہب اور حکومت ان کے ہاں دونو توام چیزیں ہیں۔ اس لیئے

اپنے ہاں کے طریقہ تعلیم کو چھوڑ کر مغربی یا کسی دوسری زبان کے نصاب کو اختیار کرنے میں نہ صرف بہ لحاظ ظاہری وجاہت کے کسرِ شان سمجھتے تھے۔ بلکہ بہ اعتبار مذہب کے بھی وہ اسے کچھ اچھا نہ سمجھتے تھے۔ حتیٰ کہ اکثر افراد کا تو یہ خیال تھا۔ کہ مغربی زبان چونکہ کفار کی زبان ہے اس لیئے اس کے حاصل کرنے میں زوال مذہب کا اندیشہ ہے، ہمیں اس سے بحث نہیں۔ کہ یہ خیال صحیح تھا یا غلط کیونکہ آئندہ واقعات نے اس کا بہترین فیصلہ کر کے دکھا دیا لیکن اس میں کلام نہیں۔ کہ اس خیال نے عرصہ دراز تک ان کو مغربی زبان کیطرف متوجہ نہ ہونے دیا۔ اور اسطرف ہندو قوم ترقی کرتی گئی، اس کا نتیجہ وہی ہوا جو کچھ ہونا چاہیئے تھا یعنی ہندوں کا درخور ارباب حکومت کی طبیعتوں میں زیادہ ہو گیا۔ اچھی اچھی نوکریاں ان کو مل گئیں۔ اور مسلمان اس مسئلہ میں بہت پیچھے رہ گئے، اس طرف جب مغربی قوم نے یہ دیکھا کہ ہندو بخوبی قوم قابو میں آگئی ہے۔ تو اُنہوں نے اس باب میں سختی کرنی شروع کی، کیونکہ نصف فتح ان کے مقصد کی ہو چکی تھی۔ اور اب وہ جان گئے تھے۔ کہ مسلمانوں کو بھی طوعاً یا کرہاً اخیر میں وہی اختیار کرنا پڑے گا جس کو ہندوں نے پہلے ہی سے اختیار کر لیا ہے،

اسی حال میں ایک زمانہ گذر گیا اور مسلمان بدستور اس زبان سے متنفر رہے لیکن چونکہ خدا کو مسلمانوں کی قوم میں ابھی ایک اور انقلاب پیدا کرنا تھا۔ اس لیئے دفعتہً ان میں ایک ایسا شخص پیدا ہوا جس نے ساری قوم کے یقین و اعتقاد کے خلاف وعظ شروع کیا، اور مغربی زبان کی تحصیل کو ذریعہ فلاح و نجات قرار دے کر اس کی عملی کوششیں شروع کر دیں، ہرچند اسپر مسلمانوں میں اول اول بہت برہمی پھیلی اور اس شخص کو خارج از مذہب قرار دیا گیا۔ لیکن چونکہ زمانہ اس شخص کا مساعد تھا، اس لیئے آہستہ آہستہ اس کے مواعظ کا اثر شروع ہوا۔ اور خاص خاص لوگوں کو اسطرف توجہ ہونے لگی اس نے دار العلوم کے نام سے ایک مکتب جاری کیا۔ اور رفتہ رفتہ مسلمانوں کے

بچے اسیں آآکر داخل ہونے لگے، ہرچند یہ ایک فال نیک تھی، اور خیال کیا جاتا تھا۔ کہ مسلمانوں کی پستی و ذلت شاید اس طرح دور ہو سکے گی۔ لیکن مستقبل نے ثابت کردیا۔ کہ یہ خیال خام تھا اور ان کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی،

ہم نہیں کہہ سکتے۔ کہ اس بانی دارالعلوم کا مدعا تعلیم سے کیا تھا۔ آیا وہ علم کو علم کی غرض سے رائج کرنا چاہتا تھا۔ یا صرف اس لیئے کہ جو مغائرت مابین حکمران جماعت و محکوم قوم پائی جاتی ہے وہ رفع ہو جائے اور مسلمانوں کو بھی معزز نوکریاں ملنے لگیں لیکن اس میں کلام نہیں۔ کہ اس شخص کے مرجانے کے بعد جن ہاتھوں میں دارالعلوم کا انتظام منتقل ہوا، وہ ایسے لوگوں کے ہاتھ تھے جنکا مقصود کبھی مسلمانوں کی ترقی نہ تھی۔ بلکہ اس سے مقصود صرف اپنے لیئے کسب جاہ و حصول عزت کی کوشش تھی اور اس کا ثبوت صرف واقعات سے ہوسکتا ہے۔ کیونکہ اُنھوں نے جو کچھ کیا اس سے مسلمان بچوں کو بجائے فائدہ پہنچنے کے سخت نقصان ہوا۔ اور وہ غریب کسی طرف کے نہ رہے، ہرچند یہ کہنا کہ مسلمانوں کو اس تعلیم سے حکومت کے ساتھ وابستگی پیدا نہیں ہوئی۔ یا ان کو چند مقتدر معزز نوکریاں نہیں ملیں۔ حقیقت سے انکار کرنا ہوگا لیکن اس کا کیا علاج۔ کہ اس نصب العین نے حقیقی مفہوم تعلیم کا پس پشت ڈالدیا۔ اور انکی اخلاقی حالت اور زیادہ خراب ہوتی گئی۔ سب سے پہلے جو غلطی ہندوستان کی قوموں نے کی، وہ یہ تھی۔ کہ اُنھوں نے اس راز کو نہیں سمجھا۔ کہ کیوں حکومت اپنی زبان کو ملک میں رائج کرنا چاہتی ہے۔ اور اگر اس راز کو وہ سمجھیں بھی تو ایک طویل زمانہ گذر جانے کے بعد جب خرابیاں حد سے متجاوز ہوگئیں اور علاج دشوار سے دشوار تر ہوگیا،

یہ امر سب کو بخوبی معلوم تھا۔ کہ یہ مغربی قوم بڑی عملی (پریکٹیکل) قوم ہے، اور اس کے ہاں ایسے علوم و فنون کثرت سے ہیں جو ایک قوم کو بہت جلد سطح ترقی پر لا سکتے ہیں لیکن کسقدر افسوس ہے کہ باوصف اس علم کے ہندوستان کی قوموں اور علی الخصوص

مسلمانوں کی قوم نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا۔ کہ صرف زبان سیکھہ لینے سے کسی زبان کے علوم و فنون حاصل نہیں ہو سکتے، اور جبتک علوم و فنون پر قابو نہ حاصل ہو، اس وقت تک حقیقی ترقی معلوم، یہ کہنا کہاں حقیقت ہوگا۔ کہ اس حکمراں قوم نے ان علوم و فنون کے سیکھنے کی ممانعت کردی تہی، لیکن اس کے ساتھہ اسمیں بہی کوئی شک نہیں کیا جاسکتا۔ کہ اس نے اسطرف زیادہ توجہ بہی نہیں کی۔ اور وہ شاید زیادہ قابل ملامت بہی نہیں کیونکہ اسے کوئی ضرورت نہ تہی۔ کہ اپنے اوقات اپنی دولت کو یہاں کی قوموں کے اوپر صرف کرتی۔ علی الخصوص اسوقت جبکہ ان میں باہم اسقدر تفاوت صورت و سیرۃ ہو۔ بہرحال پہلی غلطی تو یہی تہی۔ اور دوسری غلطی جس نے فوری اثر کیا یہ تہی۔ کہ ہندوستان کی قوموں نے اپنی ملکی معاشرت و تمدن کو یکسر فراموش کردیا، اور یہ یقین کیا۔ کہ شاید حکمراں قوم کی معاشرت ان کے لیئے زیادہ مفید و بہتر ثابت ہوگی۔ ہرچند یہ سوال تمدن و معاشرت کے متعلق ہے اور مجھے جداگانہ اس سے بحث کرنی چاہیئے تہی۔ لیکن چونکہ اس کا تعلق تعلیم سے ہی ہے اس لیئے میں یہیں بیان کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

میرا خیال ہے کہ یہ زہر اسی زبان کی تعلیم سے پہیلا۔ اور رفتہ رفتہ عام ہوگیا، اگر قومی مدارس میں یہ نکتہ فراموش نہ کیا جاتا۔ کہ زبان و معاشرت دو الگ الگ چیزیں ہیں تو شاید یہ حالت نہ ہوتی۔ اور اسقدر جلد اختلاط شروع نہ ہوتا۔ لیکن کیسا غضب ہوا کہ زبان سے پہلے معاشرت پر توجہ کی گئی اور خاص و عام ہر شخص نے اس کو بہتر سمجھا، اگر دار العلوم مسلمانوں نے قایم کیا تہا۔ اور دیگر علوم و فنون کیطرف جو واقعی ذریعۂ فوز و فلاح ہیں۔ توجہ نہ تہی۔ بلکہ صرف زبان کا حاصل کرنا۔ اور اسی طرح نوکریاں کرکرکے پیٹ پال لینا مقصود تہا، تو بہی خیر غنیمت تہا، لیکن یہ کیسا قہر ہوا۔ کہ اس کے ساتھہ اُنہوں نے اپنی معاشرت کو، اپنے مذاق کو، اپنی زندگی کو اپنے اصول تمدن کو بہی بدل دیا۔ اور اس قوم کی معاشرت و تمدن کو اختیار کرنا شروع کیا جو اپنی دولت و تمدن کے لحاظ سے اسکی

اہل تہی۔ اور زندگی کے فضول مصارف کو بہی برداشت کرسکتی تہی۔ الغرض مسلمانوں نے یہ بہت بڑی غلطی کی اور اس غلطی کی ذمہ دار قوم نہیں ہے۔ بلکہ قوم کے وہ لوگ ہیں جو اپنے تئیں مصلحین کہتے تھے۔ اور ایسا کہلایا جانا پسند کرتے تھے،

غالبا ملک مریخ کے رہنے والے یہ بات معلوم کرکے ہنسیں گے۔ کہ ہندوستان میں حال وقال علیحدہ علیحدہ ہیں۔ اور نہ صرف علیحدہ علیحدہ بلکہ بالکل ایک دوسرے کی ضد ہمارے ملک کی تو یہ کیفیت ہے کہ جبتک خود کسی شخص میں کوئی کیفیت نہ ہو۔ اس وقت تک اس کا اظہار الفاظ سے ممکن ہی نہیں۔ اگر کوئی ایسا کرنا چاہے، تو لبوں سے حرکت اور زبان سے قوت گویائی منقطع ہو جاتی ہے۔ لیکن ہندوستان کا یہ میرا عجیب وغریب تجربہ ہے کہ وہاں دل اور زبان دو الگ الگ خود سر قوتیں ہیں بہت کم بلکہ شاذ ایسا ہوتا ہے کہ زبان پر دل کی حکومت ہو۔ ورنہ اکثر صورتوں میں یہی دیکھا جاتا ہے۔ کہ زبان ہمیشہ دل کے خلاف کہتی ہے، اور اسقدر خلاف کہ میں نے تو یہ اصول قرار دے لیا تہا۔ کہ جب کسی شخص کی زبان سے ہاں نکلتا تہا۔ تو میں یہ سمجہتا تہا۔ کہ ضرور اس کے دل میں نہیں ہے، اور جب زبان کسی بات کا انکار کرتی تہی۔ میں یقین کرلیتا تہا۔ کہ اس کا دل ضرور اقرار کرتا ہے، اس اختلاف زبان کی جس کو میں اپنے ملک کے آئین کے لحاظ سے اجتماع ضدین کہونگا۔ اس قدر کثرت تہی کہ امیر سے لے کر غریب تک اور مذہبی آدمی سے لے کر پکے دنیا دار تک سب اسی مرض میں مبتلا تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ہر شخص ایک دوسرے کا مخالف اور ہر گروہ دوسرے کا دشمن بن گیا۔ اور ساری قوم کی قوم کا شیرازہ جو پہلے ہی سے منتشر تہا، بالکل برباد وتباہ ہوگیا۔ سب سے زیادہ تعجب انگیز امر یہ ہے کہ جہوٹ بولنا ان کے ہاں مذہبا داخل معصیت ہے، لیکن وہ اپنی اس حالت کو کذب ودروغ میں شامل نہیں کرتے۔ تاہم میری سمجہ میں آجتک باوجود غور وفکر کے بہی یہ بات نہیں آئی کہ اس سے علیحدہ کذب ودروغ کیونکر دنیا میں پایا جاسکتا

ہے، بہرحال ہندوستان کے لوگ علی الخصوص مسلمان اس کے عادی ہیں اور اس کو اپنی فراست و دانائی پر محمول کرتے ہیں،

اس اختلاف حال و قال سے ان کے مدارس بھی خالی نہ تھے۔ چنانچہ جب میں مسلمانوں کا دار العلوم دیکھنے گیا۔ تو مجھے یہ معلوم کرکے کسقدر حیرت ہوئی کہ وہاں کوئی درس ایسا نہیں دیا جاتا جس کے خلاف خود ان مدرسین کا طرز عمل نہ ہو۔ مثلاً وہاں ایک شعبہ تعلیم اقتصادیات سے بھی متعلق تھا۔ لیکن میں نے بہت کوشش کی کہ کوئی ایک مثال تو ایسی مل جائے جس کے حال کو بھی اس کے درس کے مطابق دیکھوں۔ لیکن کامیاب نہ ہوا،

مجھے ایک دن کیسا تعجب ہوا جبکہ ایک پروفیسر لڑکوں کو بتا رہا تھا۔ کہ بلا ضرورت کسی چیز کو لینا یہ معنی رکھتا ہے کہ ضرورت کی چیزیں بھی کسی وقت علیحدہ کرنی پڑیں گی اور حال یہ تھا۔ کہ خود اس پروفیسر کا وجود سر کی ٹوپی سے لے کر پاؤں کی جوتی تک اور لکچر روم (دار الخطابۃ) چھت کے کاغذ سے لے کر زمین کے فرش تک غیر ضروری چیزوں اور سامان آرائش سے ڈھکا ہوا تھا۔ اسی طرح وہاں ایثار و ہمدردی صلہ رحم وغیرہ کے بہت سے مواعظ ہوتے تھے۔ لیکن معلوم یہ ہوتا تھا۔ کہ یہ الفاظ یہاں صرف زبانی یاد کرلیے گئے ہیں، اور ان کا مفہوم کوئی نہیں ہے،

اس میں کلام نہیں کہ مسلمانوں کی قوم تجویز و نئے سوچنے میں ملکہ تامہ رکھتی ہے اور شاید دنیا میں کوئی قوم اس مسئلہ میں ان سے بازی نہیں لے جاسکتی لیکن جس بری طرح ان تجویزوں کی مٹی ان کے ہاں پلید ہوتی ہے، اس کی نظیر بھی کہیں نہیں ملسکتی۔ مجالس قائم کرنا۔ محافل شورے برپا کرنا دلکش و خوشنما تجاویز کے اعلان سے سارے ملک میں ایک گونج پیدا کر دینا اس قوم کے مصلحین کا معمولی کام تھا لیکن اگر یہ دیکھا جائے کہ وہ کرتے کیا تھے اس تمام شور و شغب سے فائدہ کیا تھا۔ تو

تو یہاں بس صرف صفر تھا مسلمانوں کی قوم عجیب وغریب قوم تھی۔ اور اس میں شک نہیں۔ کہ اگر کوئی ان سے کام لینا جانتا۔ تو وہ سب کچھ کر سکتی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ کسی کام کو کام کی طرح کام کرنے کا سلیقہ پیدا نہ ہوا۔ اور تمام دولت جو قوم سے لغو وبے سروپا مواعید پر حاصل کی جاتی تھی ہمیشہ چند نفوس کی ذاتی اغراض پر صرف ہوا کی غربا کو تو خیر کون پوچھتا۔ خود امرا کا طبقہ بھی اس نظام تعلیم سے کچھ زیادہ مستفید نہ ہوا۔ اور اخلاقی لحاظ سے تو اور زیادہ تباہ وبرباد ہوگیا

جب حالت یہاں تک پہنچگئی۔ اور فریب کاریاں حد سے بڑھ گیئں۔ تو قوم کے بعض افراد کو اسطرف توجہ ہوئی اور ان کے طرز عمل پر نکتہ چینیاں شروع ہوئیں، لیکن اب وقت گذر گیا تھا۔ اور مرض حد سے بڑھ گیا تھا۔ آخر علاج نہ ہونا تھا نہ ہوا اس اثنا میں دوسری قوم نے جس کو ہندو کہتے تھے بہت ترقی کر لی تھی، اور نسبتاً ان میں یہ احساس زاید تھا۔ کہ اپنی معاشرت کو حکومت کی معاشرت سے مغلوب نہ ہونے دیں، اُنھوں نے نہ صرف اس کا لحاظ رکھا۔ بلکہ اسی کے ساتھ اس نکتہ کو بھی نظر انداز نہ کیا کہ اصل راز ترقی کا صرف زبان مغرب کے حاصل کرنے میں نہیں ہے بلکہ فنون مغرب کے تحصیل میں ہے اُنھوں نے اپنی قوم کے ہونہار لڑکوں کو مغرب کے دور و دراز ممالک میں بھیجا، اور رفتہ رفتہ ان فنون کو بھی حاصل کرنے کی کوشش کی جو اسوقت تک ہندوستان سے چھپائے جا رہے تھے،

اسی زمانہ میں اتفاق سے مسلمانوں کو یہ سوجھی۔ کہ خود انکی ایک یونیورسٹی ہونی چاہیئے۔ اور خود اپنا مقرر کردہ نصاب اس میں رایج کرنا چاہیئے، اس کے لئے روپیہ جمع کیا گیا۔ لیکن چونکہ حسب منشاء اجازت گورنمنٹ نے نہیں دی اس لیئے وہ تجویز بھی درہم برہم ہوگئی۔ مگر ہندوں نے اپنی ایک یونیورسٹی قائم کرلی۔ اور اُنھوں نے کچھ پرواہ نہ کی۔ کہ اس کے شرائط کیا ہیں۔ چونکہ ان کے مدارس زیادہ تھے، اور خود انکا

بہا انصاف کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا، کیونکہ ان کا مذہبی لٹریچر عرصہ ہوا برباد ہو چکا تھا۔ اس لیئے
ان کا اس میں فائدہ تھا یہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ کہ سلف گورنمنٹ کی کوششیں
کس طرح ہوئیں مسلمانوں نے کس طرح ہندؤں کا ساتھ دیا۔ پہر آخر میں مسلمانوں کو
کس قدر زک اٹھانی پڑی، اس لیئے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ لیکن چونکہ اس کا
اثر مسلمانوں کی تعلیم پر بھی بہت بُرا پڑا۔ اس لیئے ضمناً اس کا ذکر یہاں بھی ضروری
ہے۔ جب سلف گورنمنٹ ملگئی۔ اور ہندؤں کا اقتدار نظام سلطنت میں پیدا ہو گیا
جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ تو وہ ساری رنجشیں جو اس وقت تک دبی چلی آتی
ہیں دفعتاً نمودار ہو گئیں۔ اور اس کا سب سے پہلا اثر یہ ہوا۔ کہ مسلمانوں کی مادری زبان
جو حقیقتاً سارے ملک کی مادری زبان تھی مٹنے لگی، ہندؤں نے پہلے ہی اپنی سعی و کوشش
سے اس کو اس قدر ضعیف کر دیا تھا۔ کہ دفاتر وغیرہ میں تنہا اسکی حکومت باقی نہ رہی
تھی۔ بلکہ اس میں ایک اور رسم الخط کو سہیم و شریک بنا دیا تھا۔ جو ہندؤں کے قدیم لٹریچر کے
رسم الخط کیطرح تھا۔ لیکن جب سلف گورنمنٹ ملنے کے بعد ان کے ذرایع زیادہ وسیع
ہو گئے، تو مسلمانوں کی زبان یکقلم دفاتر وغیرہ سے خارج کر دی گئی اور مسلمانوں کو
مجبور کیا گیا۔ کہ وہ اس رسم الخط کو حاصل کریں، جس کو انہوں نے کسی زمانہ میں منقلوز
کر رکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ اسپر کسقدر بڑی بے چینی ہو گی۔ لیکن اب یہ سب بے کار باتیں تھیں
اور ان کا علاج سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا، کہ وہ اپنی دوسری ہمسر قوم کی خواہشات
کے سامنے سر اطاعت خم کر دیں۔ اور خود اپنی زبان کو خیرباد کہدیں۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ چند
سال میں مسلمان زبان کے لحاظ سے ہندو صورت کے اعتبار سے، عیسائی اور قسمت
کی حیثیت سے وہی بدقسمت مسلمان رہ گئے، ان کے تمام حوصلے ان کی تمام امنگیں خاک
میں مل گئیں۔ نہ ان کے مدارس باقی رہے، نہ انکی مجالس قایم رہیں۔ نہ ان میں کوئی
ہادی رہا۔ اور نہ کوئی مقتدی۔ چونکہ یہ قوم اقتصادیات کی دشمن تھی۔ اس لیئے مالی حالت

پہلے ہی سے ضعیف تھی۔ اب سلب حقوق کے ساتھہ اس میں اور زیادہ ضعف پیدا ہوا۔ اور رفتہ رفتہ وہ ملبوس اور وضع قطع بھی ندارد ہوگئی جس کو اُنہوں نے مغرب کی تقلید میں اپنے لیئے مایۂ ناز سمجھہ رکھا تھا،،

مذہب پہلے ہی رخصت ہوچکا تھا۔ دنیا یوں روٹھی۔ اول تو تعلیم پہلے ہی کم تھی۔ اور جو کچھہ تھی بھی وہ سلف گورمنٹ پر قربان کردی گئی، اب مسلمان کو وہ زمانہ یاد آیا جب اس نے اول اول مغربی زبان کی تحصیل سے گریز کیا تھا۔ اور پھر وہ مذہبی تعلیمات اس کو یاد آئیں۔ جو اس کو صحیح تربیت کی راہ دکھانے والی تھیں لیکن جب مایوسی حد سے گذر جاتی ہے۔ تو کامیابی کا سلسلہ غیر منقطع ثابت ہوتا ہے تو انسان پریشان ہوجاتا ہے۔ اور پھر اس کی سمجھہ میں نہیں آتا۔ کہ وہ کیا کرے، پھر اگر مسلمانوں کی بھی یہی حالت ہوئی تھی تو جائے عجب نہیں لیکن اس سے کم از کم دوسری قوموں کو عبرت حاصل کرنی چاہیئے، کہ تعلیم صرف اسی وقت تک مفید ہوسکتی ہے جب اس سے اخلاق پر اچھا اثر پڑے۔ جو ساتھہ ہی ساتھہ تربیت کی بھی حامی ہو، ورنہ اس کا نتیجہ ہمیشہ خراب ہوا کرتا ہے، ہرچند میرے برادران ملک تعلیم و تربیت کے دو جدا جدا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہیں گے، اور شاید انہیں اس قدر شرح و بسط کے ساتھہ بیان کرنے کے بعد بھی اس کے یقین کرنے میں تامل ہوگا۔ لیکن اُنھیں باور کرنا چاہیئے۔ کہ جو کچھہ میں نے لکھا ہے۔ صحیح ہے، اگر مسلمان اپنی تعلیمات مذہبی کے ساتھہ ساتھہ علوم مغربی کو حاصل کرتے تو ہرگز ان میں ضعف پیدا نہ ہوتا اور ان کے قوائے عملیہ کبھی بے کار نہ ہوتے لیکن اُنھوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس لیئے یہ انکی سزا تھی جس پر اب صرف اظہار تاسف کیا جاسکتا ہے،

بیتسرا صفحہ

میری ڈائری کا یہ جزو جس کے ہر ہر لفظ کو میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے لکھنے کے بعد بھی گھنٹوں دیکھا ہے اور دونوں مبہوت و متحیر رہا ہوں۔ معلوم نہیں میرے ملک کی پبلک اس کو کس نگاہ سے دیکھے، لیکن اسمیں کلام نہیں۔ کہ ایک غیر ملک کے سیاح کے لیئے اگر ہندوستان کی کوئی چیز ایسی ہے، جو باوجود نارو او نادرست ہونے کے بھی دلفریب و خوشنما ہے تو وہ صرف یہاں کا طبقہ لطیف اور یہاں کے اس طبقہ کا طرز معاشرت ہے۔ جو اپنے اندر خدا جانے کس بلا کی کشش رکھتا ہے اور ناخوش گوار چیز کو بھی خوش گوار تسلیم کرا دیتا ہے، میں اس امر کا فیصلہ کرنے سے قاصر رہا ہوں۔ کہ موجودہ حالت اس طبقہ کی کسی واقعی ارتقاء صحیح کا نتیجہ ہے یا ضلالت و گمراہی کی کھلی ہوئی صورت، مگر اس میں کلام نہیں۔ کہ ہمارے ملک کی عورتوں کو کسی بات میں ہندوستان کی عورتوں سے تشبیہ نہیں دیجا سکتی۔ یہانتک کہ میں بعض اوقات متحیر ہو جاتا ہوں۔ کہ اگر اپنے ملک کی عورتوں کو میں عورت سمجھوں۔ تو ہندوستان کے اس طبقہ کو کیا کہوں،

جس وقت اوّل اوّل میں نے ہند اور سرزمین ہند میں قدم رکھا سب سے پہلی وہ چیز جس نے نمایاں طور سے مجھے، میرے دل، میرے جذبات، میری قوتوں اور میرے ارادوں کو اپنی طرف کھینچا۔ وہ وہاں کی عورت تھی۔ وہ کھلا ہوا بے نقاب چہرہ، وہ پھڑکتی ہوئی چتونیں، وہ دعوت دینے والی آنکھیں، وہ خود مختارانہ قہقہے، وہ آزادانہ کرشمے، وہ بے اختیارانہ عشوے، اور اس کے علاوہ ہزاروں اور ایسی ادائیں جس کا ہمارے ملک کی عورتوں میں کوسوں پتہ نہیں ہے، اور نہ جن کے لیئے ہماری زبان میں کوئی لفظ۔ الغرض یہ سب باتیں ایسی تھیں: جنہوں نے مجھے دیوانہ کر دیا۔ آپ متعجب ہونگے۔ کہ کرۂ مریخ کے اس بوڑھے سیاح کو کیا ہو گیا، لیکن

آپ یقین کریں۔ کہ میں اسوقت اپنے اندر اک کہوئی ہوئی طاقت سمجھنے اور متاثر ہونے غور کرنے اور کف افسوس ملنے کی عود کرتی ہوئی پاتا تہا۔ اور کسی طرح یہ بات سمجھ میں نہ آتی تہی۔ کہ میں کیونکر یہانکی عورتوں کا حال بیان کروں اور کسی طرح یہاں کی ایک عورت کو پکڑ کر اپنے ملک میں لے جاؤں۔ اور اس کو سامنے رکھہ کر لوگوں کو بتاؤں کہ دیکھو قرب قیامت کی سب سے زیادہ عظیم الشان اور یقینی علامت یہ چیز ہے سو اس سے جہانتک ممکن ہو بچو۔ اور قیامت کو کبہی دعوت نہ دو۔ کیونکہ میرے نزدیک اس سے زیادہ تباہ کن چیز دنیا میں اور کوئی نہیں ہے۔ یہانتک کہ اگر میرے اختیار میں ہو۔ تو میں کبہی سلطنت مریخ کو یہ مشورہ نہ دوں۔ کہ وہ اپنے دشمن ملکوں سے جنگ کرے اور اس طرح ان پر فتوحات حاصل کرے۔ بلکہ صرف ہندوستان کی چند عورتیں پکڑ پکڑ کے وہاں بہجوادے، پہر آپ وہ ملک چند دن میں مکہی مارنے لگے گا، اور خود تباہی کی اس حد تک پہنچ جائے گا۔ جہاں مفتوح و مغلوب ہونا ہی بڑی کامیابی سمجھی جاتی ہے، یقیناً میں اخفاء حقیقت کا مجرم قرار دیا جاؤنگا۔ اگر یہ ظاہر نہ کروں۔ کہ ہندوستان کی عورت بے انتہا ذہین، نہایت تیز و ہوشیار ہے میں نہیں کہتا۔ کہ شوخ و شریر کے الفاظ سے انکی صحیح حالت کا اندازہ ہوسکتا ہے یا نہیں ورنہ شاید میں ان کا استعمال کرتا۔ سب سے زیادہ عجیب بات جو وہاں کی عورتوں میں دیکھی گئی۔ ان کے کیرکٹر کا عمق ہے، ہم وہاں ایک عورت کو دیکھتے ہیں۔ اور اس کی حالت انداز وغیرہ سے سمجھتے ہیں۔ کہ یہ بہت مغرور و سرکش ہے لیکن اسوقت جبکہ ہم یہ خیال قایم کرتے ہوتے ہیں۔ دفعتہً وہ کسی مخاطب ہوتی ہے، اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس سے زیادہ ذی اخلاق متواضع منکسر مزاج اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ مگر ابہی ہم یہی حکم لگاتے ہوتے ہیں، کہ وہ آدمی چلا جاتا ہے، اور پہر ہم اس عورت کو ایک عجیب انداز سے اسپر ہنستے، اس کی حقارت کرتے اور اس کیطرف سے منہ پہیر لیتے دیکہہ لیتے ہیں، الغرض وہ ایک آن واحد میں اس قدر متضاد

متباین اور باہمد گر ایسے منافی مناظر کی تصویر بن جاتی ہے۔ کہ ایک شخص متحیر ہو جاتا ہے کہ آخر اسے کیا سمجہا جائے، اور اس کے کیرکٹر پر کیا حکم لگایا جائے۔ مینے اسکی مثالیں اسقدر کثرت سے دیکہیں، کہ آخر کار مجھے مجبوراً ماننا پڑا۔ کہ ہندوستان کی عورت ایک نظر بندی ہے، ایک شعبدہ ہے۔ جس کو دیکھنے والا کبھی نہیں سمجہہ سکتا، خواہ وہ کتنا ہی غور کرے،

میں نے جستجو کی کہ ہندوستان کے اس طبقہ کی حالت ہمیشہ سے ایسی ہے یا اب ہو گئی ہے۔ تو معلوم ہوا۔ کہ یہ نتیجہ ہے جدید ترین ترقی کا، اور ایسا عجیب و غریب نتیجہ ہے کہ اگر اب سے ایک صدی پہلے کی کوئی عورت لا کر کہڑی کر دی جائے تو وہ اپنے ہم جنس کی یہ حالت دیکہہ کر شاید یہ بہی مشکل سے یقین کرے کہ یہ عورت ہی ہے۔ یا کوئی اور بلا۔ اور اگر وہ یقین کرے کہ یہ عورت ہی ہے تو شاید کبھی اس کے سامنے بے پردہ ہو کر آنا گوارا نہ کرے۔ میں نے جسوقت اپنی ڈائری کے ماسبق صفحات میں تعلیم ہند کے مسئلہ پر گفتگو کی تہی۔ اسوقت تعلیم نسوان کے مسئلہ کو قصداً نظر انداز کر دیا تہا کیونکہ اس کے متعلق مجھے مستقل باب جداگانہ قایم کرنا تہا۔ لیکن یہ بات آپ کو اس جگہ بہی معلوم ہو گئی ہوگی، کہ مسلمانوں میں عام طور سے کس طرح کی تعلیم کا رواج ہوا۔ اور ہندوں میں کسطرح، اور پہران دونو طبقو پر اسکا کیا اثر ہوا،

جس زمانہ میں تعلیم کا زور ہوا۔ اور حشرات الارض کیطرح بے شمار لیڈران قوم تعلیم و قومیت کا لوائے ناساعدے کر اٹہہ کہڑے ہوئے اسوقت ان میں بعض افراد ایسے بہی پیدا ہوئے۔ جنہوں نے صرف طبقہ اناث کی تعلیم و تربیت کو اپنا میدان عمل قرار دیا۔ اور اس کے لیئے اپنی زندگیاں قربان کر دیں، لیکن چونکہ بے اصولی انکی خمیر میں تہی۔ کم فہمی اور ناعاقبت اندیشی ان کے ترکیب دماغی کے تین چوتہائی حصے پر مستولی تہی، اس لیئے وہ مطلق اس بات کو نہ سمجہہ سکے، کہ مرد و عورت میں کیا فرق

ہے۔ اور ان دونو کے فرائض ایک دوسرے سے کسقدر علیحدہ علیحدہ ہیں۔ الغرض وہ لیڈران ضعیف الدماغ بالا کوئی حد فاصل قایم کئے ہوئے دفعتاً چیخ اٹھے۔ کہ جبتک عورتوں میں تعلیم نہ ہوگی، ملک ہرگز ترقی نہیں کرسکتا۔ کیونکہ مرشد اعظم نپولین کہہ گیا ہے کہ پہلے ملک کی ماؤں کو قابل بناؤ۔ اور پھر فرزندان ملک کی ترقی کا خواب دیکھو" جسوقت تک یہ اُپیچ نہ لی گئی تھی۔ اسوقت تک ہندوستان کی عورتیں نہایت باحیا، غیرت دار شرم و عفت کی دیویاں، ہمدردی والفت کی پتلیاں تہیں۔ ان کو یہ خبر ہی نہ تھی۔ کہ سوائے اپنے شوہر کی اطاعت۔ بچوں کی نگہداشت، اور خانہ داری کے انتظام کے اور بھی کوئی فضا دنیا میں ہے۔ جس کی انہیں خبر نہیں۔ چنانچہ اول اول جب یہ آواز بلند ہوئی، اور رفتہ رفتہ پردوں کے اندر پہنچی، تو سخت مخالفت ہوئی، اور سخت نفرت کے ساتھ اس خیال کو رد کر دیا گیا۔ لیکن مردوں کے اوپر کسی معمولی جن کا سایہ تو تھا نہیں۔ کہ یوں آسانی سے دور ہو جاتا۔ انہوں نے اپنے پندار میں مرض کی حقیقی علت، کام کے اصل رشتہ کو پا لیا تھا۔ اور انہیں خدا کے وجود سے زیادہ اس بات کا یقین تھا۔ کہ اگر ملک کی حالت سنبھل سکتی ہے تو صرف عورتوں کو آزادانہ تعلیم دینے سے، یا یوں سمجھیئے کہ اگر قوم قوم بن سکتی ہے۔ تو صرف عورتوں کے بگاڑنے سے،

اس میں کلام نہیں۔ کہ عورتوں نے بڑی حد تک اس کی مخالفت کی۔ لیکن وہ ضعیف جنس وہ کمزور طبقہ اس مخالفت میں زیادہ کامیاب نہ ہوا۔ اور رفتہ رفتہ ان کو مردوں کی خواہشوں کے سامنے سر عجز جھکا دینا پڑا۔ یہانتک کہ باضابطہ اسکول قایم کر دیئے گئے، اور وہاں عورتیں، لڑکیاں جانے لگیں۔ اور اسطرح انہوں نے اپنے جوہر ذاتی کو بدبخت مردوں کے اوپر سے قربان کر دینے کے لیئے پہلا قدم اپنی ڈیوڑہی سے باہر نکالا۔ اور اسی کے ساتھ مردوں میں یہ جوش بھی پھیلا۔ کہ پردہ نہایت لغو

رسم ہے۔ اور وہ بہت سی ان انسانی قوتوں کو ضعیف کر دیتا ہے۔ جن سے کام لینا عورتوں پر بھی فرض ہے۔ مگر اس میں اوّل اوّل مطلق کامیابی نہیں ہوئی۔ کیونکہ ہر واعظ اور ہر لیڈر دوسروں ہی کے لیئے پردہ شکنی کو امر مستحسن سمجھتا تھا، اور جب خود اس کے گھر کی عورتوں کا سوال آتا تھا۔ تو وہ دم بخود ہو جاتا تھا

چونکہ ہر شخص اپنی اپنی جگہ اچھی طرح اس بات کو سمجھتا تھا۔ اور علاوہ اس کے عورتوں کی طرز معاشرت ابھی بہت کچھ اصلاح طلب تھی۔ اس لیئے یہ جذبہ کچھ کم ہو گیا مگر ذرا زیادہ زیرک لوگوں نے سمجھ لیا۔ کہ بے پردگی کے رواج پر زور دینا بے کار ہے حسب زیر تجویز طریقہ تعلیم کا رواج عورتوں میں ہو جائیگا۔ تو وہ خود ہی پردہ اٹھا دینگی اور بغیر کسی مزید سعی و کوشش کے اس مقصد میں کامیابی ہو جائے گی۔ اور واقعی یہ خیال بالکل صحیح نکلا۔ جب اسکول قایم ہوئے، تو کچھ عرصہ تک وہ زیادہ آباد نہ ہو سکے۔ لیکن رفتہ رفتہ عورتوں کی وہ شریفانہ وحشت کم ہونے لگی۔ اور دولتمند طبقوں کی عورتیں اسکولوں میں داخل ہونے لگیں۔ ان اسکولوں میں زبان انگریزی کی تعلیم کے علاوہ اور وہ تمام باتیں ان کو سکھائی جاتی تھیں۔ جو ان میں حد درجہ دلفریبی و دلکشی پیدا کر دیں مثلاً موسیقی، اصول زیبایش و آرایش اوضاع واقطاع ملبوس کا علم، رقص و نغمہ وغیرہ وغیرہ افسوس ہے۔ کہ میں اس زمانہ میں وہاں نہیں تھا۔ کہ اس تدریجی ارتقا کو قلم بند کر سکتا۔ لیکن میرے بعض احباب کا بیان ہے۔ کہ انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ وہ عورتیں جنکی پردہ داری شرم و حیا۔ اور عفت و حجاب کی قسم کھائی جاتی تھی۔ انہی کی لڑکیوں کا چند دن میں یہ حال ہو گیا۔ کہ شام کو باغ کے کوٹھوں پر جہاں زنانہ اسکول کا بورڈنگ تھا۔ رنگین آنچلوں کے پھریرے اڑانے لگیں۔ اور جھلملیوں اور چکوں میں ایک جان ڈالدی کہ جب دیکھو وہ متحرک و بیقرار ہیں

ممکن ہے میرے ملک والے معترض ہونگے کہ اس حد تک کیا خرابی آئی۔ اگر ان میں دلفریبی اور دلکشی زیادہ ہوگئی۔ اگر وہ زیادہ فہیم و ذی ہوش ہوگئیں۔ اگر ان میں سلیقہ بڑھ گیا۔ تو کیا برائی ہوئی۔ لیکن سوال یہ ہے، کہ اس کا اثر کیسا ہوا۔ اور دیکھنا یہ ہے، کہ اندرونی زندگی میں کیا انقلاب ہوا، اسپر جب غور کیا جاتا ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس لحاظ سے بہت بڑا اثر پڑا۔ اور ہزاروں خاندان تباہ ہوگئے اس کیوجہ ظاہر ہے۔ کیونکہ جب لڑکی تعلیم سے فارغ ہو کر نکلی، تو وہ خیال دماغ میں لے کر نکلی۔ کہ میں عورت ہوں، اور ایسی چیز ہوں کہ جس کے لیئے دنیا کا ہر مرد بے قرار ہو سکتا ہے، پھر اس نے غور کیا۔ کہ جب عالم میں میں اس قدر اضطراب پھیلا سکتی ہوں، تو میں مستحق ہوں۔ کہ تسکین اضطراب کے لیئے بڑی سے بڑی قیمت طلب کروں اور پاؤں۔ اگر میں کسی سے شادی کروں اور وہ اس قیمت کو ادا نہ کر سکے تو مجھے ہر وقت حق حاصل ہے کہ معاملہ اس سے توڑ دوں۔ اور کسی اور سے کروں جو زیادہ اہل ہو۔ اول تو میں صرف اس لیئے نہیں ہوں۔ کہ دنیا کی آبادی میں اضافہ کیا کروں اور اگر یہ بھی ہو تو بھی بچوں کو دودھ پلانا۔ انکی ایسی خدمت کرنا جس سے میری آرائش و زیبائش آلودہ ہو، ہرگز درست نہیں ہے۔ میں تو اس عالم میں مردوں کے برابر حقوق لے کر آئی ہوں۔ اور جسطرح وہ تمام نعایم و لذائذ سے مستفید ہوتے ہیں اسی طرح مجھے بھی ہونا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ جب کسی عورت کے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا، تو وہ کیا کچھ نہ کرے گی، نتیجہ یہ ہوا۔ کہ شوہروں سے محبت کم ہوگئی، بچوں کی نگہداشت کا خیال ضعیف ہوگیا۔ خلوص و ہمدردی کم ہوگئی انتظام خانہ داری سے نفرت ہونے لگی اور تھوڑے دنوں میں مرد محسوس کرنے لگے۔ کہ ہم نے عورت سے شادی نہیں کی ہے۔ بلکہ عورت نے اپنے ساتھ کی ہے اور اس کو حق حاصل ہے جسطرح چاہے ہم کو رکھے۔ خیر اگر امراء و روساء یا کسی خاص طبقہ میں یہ حالت ہوتی تو بھی زیادہ رونا نہ تھا۔ بلکہ قہر تو یہ ہوا۔ کہ وبا عام ہوگئی اور ہندوستان

لگا پھر گھر اس میں مبتلا ہو گیا۔ اب خیال فرمائیے کہ ایک غریب جو روزانہ صرف اس قدر کماتا ہے کہ سادگی کے ساتھ اپنے اور اپنے اہل وعیال کا پیٹ بھر سکے۔ شام کو اپنی دن بھر کی کمائی بیوی کے سامنے لاکر ڈال دیتا ہے اول تو وہ نگاہ حقارت سے اس حقیر رقم کو دیکھ کر ٹھکرا دیتی ہے، اور پھر اگر ہاتھ میں لے لی تو کبھی اس کو دیکھتی ہے اور کبھی اپنے لباس کو، کبھی لانے والے کی صورت کو دیکھتی ہے، اور کبھی اپنی طرحداری کو، مطلب یہ کہ اب مجھ سے تم سے نہیں نبھ سکتی، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تھوڑے دنوں میں یا تو وہ غریب اس قدر مقروض ہو جاتا ہے کہ آخر کار اسے خودکشی کرنی پڑتی ہے یا پھر وہ بی صاحبہ کسی دن باغ کی روشوں پر کسی دوسرے مرد کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے ٹہلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اپنے رکھ رکھاؤ سے فرصت ہو۔ تو بچوں کی فکر ہو بچوں کو دودھ پلانا معیوب ہو گیا۔ کہ اس سے شباب جلد زائل ہو جاتا ہے۔ اور اسطرح اناؤں کے مصارف ایک طرف بڑھے اور دوسری طرف بچوں کیطرف سے وہ الفت کم ہوئی جو خود دودھ پلانے کی حالت میں ایک ماں کو ہوتی ہے،

الغرض تعلیم نسوان کے ساتھ یہ تمام مشکلات بڑھتی رہیں۔ اور مردوں کی دولت کا کثیر حصہ انکی دلربائیوں، عشوہ سازیوں اور ناز آفرینیوں پر قربان ہونے لگا چونکہ یہ خواہش عورتوں کی اس قدر قوی ہو گئی۔ کہ مردوں کو مجبوراً اس کے سامنے سر جھکا دینا پڑا۔ اور ادھر مردوں کی مالی حالت کمزور ہو گئی۔ اس لیئے رفتہ رفتہ وہ زمانہ آگیا۔ کہ عورت بازار کی ایک جنس ہو گئی۔ اور اس کی محبت، اس کی راحتوں، اس کے حسن وجمال کا علی الاعلان سودا ہونے لگا۔ اور وہی کامیاب ہوا جس کے پاس زیادہ دولت ہے

وہ زمانہ جب مرد رات کو تھکا ہوا اپنے گھر میں آتا تھا۔ اور اپنی سادہ مزاج محبت کرنے والی بیوی کے پرخلوص سینہ میں سچے جذبات ہمدردی معلوم کر کے دن بھر کی خستگی کو بھول جاتا تھا۔ خواب وخیال ہے۔ اب مرد صرف ذلت و رسوائی خستگی

وپریشانی مایوسی و ناکامی ہے، اور عورت لطف وعیش، دولت وکامرانی، آزادی خود و مختاری جس کی حکومت دلوں پر تو نہیں، مگر خزانوں پر ضرور ہے اور جسکی تعظیم کا معیار صرف اپنی مادی کامیابی کے لحاظ سے طیار ہوتا ہے۔ خود دیکھ بھال کے، جانچ کے پرکھ کے شوہر ڈھونڈنا۔ چار دن میں اس سے اور اس کی دولت سے سیر ہو کے دوسرا سینہ تلاش کرنا۔ بچوں سے نفرت کرنا۔ باغوں میں گھومنا، گاڑیوں میں بیٹھ بیٹھ کر صحیح تمدن و معاشرت کو روندتے پھرنا جس کو جی چاہے ایک تبسم سے زندہ اور جس کو جی چاہے ایک چین بہ جبیں سے ہلاک کر دینا۔

یہ ہے ہند میں اس عورت کا حال جو ہمارے ہاں ہر وقت گھر میں بیٹھی یہ غم کیا کرتی ہے کہ کس طرح اپنے شوہر کی تکالیف کو دور کر سکوں۔ اور کیونکر اپنے بچوں کی آرام و آسایش پر اپنی زندگی قربان کر دوں۔ میں نہیں کہتا کہ دنیا کس عورت کی تعریف کرے گی لیکن کم از کم میری رائے تو یہی ہے کہ خدا میرے ملک کو اس انقلاب سے بچائے رہا لطف و مسرت عیش و تفریح کا خیال سو میں نے یہ ارادہ کر لیا ہے۔ کہ جب تک جیتا رہوں گا ہندوستان ہوا کرو نگا۔ اور بس۔

اے نپولین تو نے اپنے ملک کی ماؤں کو قابل بنا کے قوم کو درست کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ لیکن اس میں کلام نہیں۔ کہ تو نے ہندوستان کی قوموں کو علے الخصوص مسلمانوں کو تو بالکل تباہ و برباد کر دیا

چوتھا صفحہ

میں یہ پہلے بیان کر چکا ہوں۔ اور اپنے ہم وطنوں کو اچھی طرح سمجھا چکا ہوں۔ کہ ہندوستان کی موجودہ سلطنت گورنمنٹ کیونکر قایم ہوئی۔ کس قسم کا جد وجہد اس کے حصول کے لئے کیا گیا۔ اور دونوں قوموں میں کسقدر تفاوت ہے۔ ایک کیسی بلند مرتبت، متمول، ذی اقتدار اور بارسوخ ہے، اور دوسری اس کے مقابلہ میں

کس درجہ ادنیٰ، غریب، حقیر، اور ناکارہ ہے۔ دونوں کی تعلیمی حالت کا بھی ذکر کر چکا ہوں۔ اور ان کے طبقہ نسوان پر بھی کافی روشنی ڈال چکا ہوں۔ اور غالباً ایک سیاح ہونے کی حیثیت سے میرا فرض یہیں ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن خدا کی مخلوق ہونے کے لحاظ سے جو رشتہ و تعلق کرۂ ارض کے باشندوں کو ہمارے کرۂ مریخ کے رہنے والوں سے ہے۔ وہ مجھے مجبور کرتا ہے۔ کہ صرف واقعات کے احصار اور حوادث کے شمار پر بس نہ کروں۔ بلکہ ایک عام نظر ڈال کر کسی ایسے نقطہ پر پہنچنے کی بھی کوشش کروں جو نہ صرف کرۂ ارض کے اس فلاکت زدہ۔ اور تباہ و برباد ملک (ہندوستان) کے رہنے والوں کو کچھ مدد دے سکے۔ بلکہ خود ہمارے ملک کے لئے بھی نتیجہ خیز ہو۔ مجھے معلوم نہیں، کہ ہندوستان والے فطرت کی اس محکم ترین مدافعت کو جانتے ہیں یا نہیں لیکن میرے ملک کا ہر ہر فرد اس کا یقین رکھتا ہے۔ کہ کبھی کوئی قوم تباہ و برباد نہیں ہو سکتی۔ تباہ ہونے والی جماعت قوم نہیں ہوتی۔ بلکہ پراگندہ افراد کا ایک مجموعہ پریشانی یا ایک پریشان اجتماع ہوتا ہے جس کو غلطی سے لوگ قوم کہتے ہیں۔ ایک جماعت ہمیشہ اسی وقت تک قوم کہلائے گی، جبتک وہ ترقی کر رہی ہے۔ جبوقت تک وہ اپنے مقاصد و اعمال میں کامیاب ہے، اور جہاں اس میں انحطاط شروع ہوا۔ سمجھ لو۔ کہ اس سے پہلے اس جماعت کی قومیت جاتی رہی ہے، اور وہ جماعت قوم نہیں تھی۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ کیوں لوگ ایک لفظ کو غلط مفہوم میں استعمال کر کے اس لفظ کی حقیقی قوت و وقعت کو زائل کر دیتے ہیں۔ یہ ہر ایک جماعت کے ایسے افراد کو جو اپنے تئیں اجزاء قوم سمجھتے ہیں سب سے پہلے خواہ وہ کسی حالت میں ہوں۔ ترقی میں ہوں یا انحطاط میں، اوج میں ہوں حضیض میں، یہ دیکھنا چاہیئے۔ کہ آیا واقعی وہ اجزاء قومیت ہیں یا نہیں۔ اگر ہیں تو نہیں بے فکر ہو جانا چاہیئے کہ وہ کبھی ذلیل و خوار نہیں ہو سکتے۔ اور دنیا کی کوئی قوت ان کو پامال نہیں کر سکتی۔ اور اگر نہیں ہیں، تو ان کو یقین کر لینا چاہیئے۔ کہ وہ فنا ہو چکے، خواہ وہ

فنا نہ ہوئے ہوں (کیونکہ فنا کے مدارج نہیں ہیں۔ اس کا صرف ایک درجہ ہے اور وہ کچھ نہیں ہے سوائے انتزاع قومیت کے)

ہر چند مجھے اپنے ملک والوں کے سامنے اس بات کے ظاہر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کہ قومیت کس کو کہتے ہیں، اور اس سے مقصود کیا ہے۔ کیونکہ ہمارے ہاں انتزاع قومیت، انتشار، افتراق انفکاک اور اسی قسم کے الفاظ کا جن سے "فصل وانفصال" کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ وجود ہی نہیں ہے، اور اس لیئے میرے ملک والے جب تک خود ہندوستان جا کر معائنہ ومشاہدہ نہ کریں اس بات کو سمجھ ہی نہیں سکتے، کہ باہمی "نفاق وعداوت" کیا چیز ہے۔ تاہم میں کچھ نہ کچھ ظاہر کرونگا۔ نہ اس لیئے کہ میں اپنے برادران وطن کی معلومات میں اسطرح کچھ اضافہ کر سکوں گا بلکہ اس غرض سے کہ ممکن ہے ہندوستان والے اب بھی اس حقیقت کو سمجھیں جس کو اُنہوں نے بھلا دیا ہے۔ اور اس صداقت سے تمرد وسرکشی نہ کریں جس سے تمرد وسرکشی کرنے والا کبھی زندہ نہیں رہ سکتا،

جس رسول کے ماننے والے ہم ہیں، اسی رسول کی ماننے والی وہ بدنصیب قوم بھی ہے، جو اسوقت ہندوستان میں سب سے زیادہ ذلیل وخوار ہے۔ اور شاید ہمارے لیئے یہ بہت بڑی وجہ ہے کہ اس کے حال پر اپنا دل دکھائیں۔ اور حتی الامکان اسکی مدد سے دریغ نہ کریں۔ غالباً کیا یقیناً ہم لوگوں کے لیئے یہ عجیب وغریب خبر ہوگی کہ دنیا میں ایک ایسی قوم بھی ہے۔ (میں نے قوم کہا ہے صرف منتشر جماعت کہنا چاہیئے) جو اپنے تئیں محمدؐ کی پیرو بتاتی ہے، اور پھر وہ اس درجہ حقیر وخوار ہے۔ مگر نہیں یہ ایک واقعہ ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اور لامحالہ ہم کو اسپر ازبس تحیر وتعجب ہونا پڑتا ہے،

مجھے خود اپنے ملک کی تواریخ کا حوالہ دینے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہ آپ لوگوں کو معلوم ہے۔ کہ جس وقت تک محمدؐ کی تعلیمات ہم تک نہ پہنچی تھیں۔ ہماری کیا حالت تھی اور ہم کیا چیز تھے ہمارے ہاں کے آتشی طبقہ نے جو جو مظالم خود اپنے ہی شعلوں (قبیلوں) پر

کیے تھے اس کے ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں، لاکھوں غیر آباد مقامات جہاں کی خاکستر آج بھی کرہ ارض کے اوپر آتشیں تودوں اور شعلہ بار پہاڑوں کی صورت میں موجود ہے۔ اس کے شاہد ہیں کہ جو کیفیت نوری طبقہ کی تھی وہ بھی اظہر من الشمس ہے کہ اس کی سیاہ کاریوں سے دنیا کی کتنی راتیں بنیں، اور ابتک ختم نہیں ہوئیں اور سلسلہ برابر جاری ہے۔ لیکن بایں ہمہ جب ہمارے اندر وہ پیکر نور پیدا ہوا جس کے ظل کو زمین والے محمدؐ کے نام سے یاد کرتے ہیں اور اس پیکر نے ہمیں توحید و اخوت مودت و محبت کی تعلیم دی، تو ہماری حالت دفعتہً بدل گئی، یہانتک کہ آج بھی باوصف اس کے کہ اس پیکر نور کو فضائے فطرت میں تحلیل ہوئے زمانہ گذر گیا۔ ہم کو خبر نہیں کہ ایک ہستی کے دو پہلو کیونکر ہو سکتے ہیں۔ اور وہ کیا چیز ہے جس سے کثرت کا مفہوم اختلاف اعداد کی بنا پر معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں مفہوم زندگی صرف ہمارا دل ہے اور ہماری ساری ہستی اس دل کی یکسانیت۔ اگر ہم کو اللہ نے ایک خاص قوت امتیاز باہم ایک دوسرے کو پہچاننے کی نہ دی ہوتی۔ تو ہم ایک دوسرے کو پہچان بھی نہ سکتے۔ کیونکہ ہم لوگ سب دل ہیں۔ اور دل میں بھی متعدد نہیں۔ بلکہ صرف ایک۔ پھر کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ وہی تعلیم ایک جگہ تو باہم ایسا وصل کردے اور دوسری جگہ ایسا فصل، ایک جگہ وہ ایسے شدید اجتماع کی شکل میں ظاہر ہو اور دوسری جگہ اسدرجہ سخت انتشار کی کیفیت میں۔ حقیقتاً ایک بڑا راز ہے جس کو زمین والے بہت کم سمجھتے ہیں۔ اور جو چند سمجھنے والے ہوئے بھی تو انہوں نے زیادہ اعتنا طرف اس کے نہیں کیا۔ علاوہ اس کے زمین والے اپنے تعلق کے لحاظ سے بھی ایک حد تک ہم سے پیچھے ہیں اور یہ ایک سبب اور بھی انکے دھوکہ کھا جانے کا ہوا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ محمدؐ تمام مخلوقات عالم کے لیے مبعوث ہوئے تھے خواہ وہ کہیں ہو۔ اور کسی کرہ میں آباد ہو۔ اور اسی مخلوق کے لحاظ سے ان کا ظہور بھی ہر جگہ جداگانہ طریقے سے ہوا۔ چونکہ اصل ذات نبی نور محض ہے، اس لیے وہ مخلوق (یعنی ہم) جو عالم ادنےٰ سے بالاتر تھی۔ اور عالم

اعلیٰ کی نورانی مخلوق کہلاتی تھی۔ اس کو زیادہ موقعہ ملا۔ کہ وہ اس نورِ محض کے مطالب کو سمجھے۔ کیونکہ ایسی مخلوق کا تعلق مجرد ذات نور سے زیادہ قریب و متصل تھا۔ برخلاف زمین والوں کے جو اجسام کثیفہ رکھتے ہیں۔ کہ وہ نور کی زبان اور عالم نور کی ہدایات وتعلیمات کو اس خوبی کے ساتھ نہیں معلوم کر سکتے، چونکہ زمین والوں پر اس نورِ محض کا ظہور اُنھیں کے سے ایک جسم کی صورت میں ہوا تھا۔ اس لیئے کرۂ ارض والوں نے یہ سمجھا۔ کہ حقیقتاً اس کی تعلیم بھی ہماری اس دنیائے مادی وکثیف کی سی تعلیم ہوگی نہ کہ کچھ اور، حالانکہ سب سے بڑی غلطی یہی تھی جس میں زمین والے مبتلا ہوگئے، اور آخر میں تباہ و برباد۔ جس وقت تک ان لوگوں نے اس راز کو سمجھا۔ اور رسول اللہ کی تعلیم کو صرف ارشاد زبانی کیطرح نہیں سنا۔ بلکہ اس سے اپنے لیئے عملی زندگی کی راہیں بنائیں۔ اسوقت تک اُنھوں نے حکومت بھی کی۔ ان کے پاس دولت بھی رہی۔ اقبال بھی ان کا امین رہا، عزت وسطوت بھی ان سے وابستہ رہی۔ لیکن جب اُنھوں نے اس حقیقت کو فراموش کرنا شروع کیا۔ تو ان میں زوال بھی شروع ہوگیا۔ یہانتک کہ اب وہ کیفیت ان میں بالکل مفقود ہوگئی ہے۔ اور اس کے ساتھ وہ ذلت و خواری کے اس درجہ تک پہنچ گئے ہیں۔ جو درجہ صفر سے خدا جانے کے درجہ گرا ہوا ہے۔ ہم تو اس کا قیاس بھی پوری طرح نہیں کر سکتے۔ میرے ملک والے اس کو ابھی اچھی طرح نہیں سمجھ سکے ہونگے کہ یہ کیا بات ہے۔ اور ایسا کیونکر ہو سکتا ہے۔ مگر میں اُنھیں ذرا تفصیل سے بتاؤں گا۔ کہ میرا مقصود کیا ہے

ہمارے ملک میں تو یہ کیفیت ہے۔ کہ یہاں کوئی زبان ہی نہیں ہے سوائے حرکات کے اب میری یہی ڈائری ہے کہ کوئی تحریر نہیں ہے۔ اور نہ تقریر۔ بلکہ وہ مجموعہ ہے میری حرکات کا۔ زمین والے سمجھے ہونگے کہ میں نے یہ حالات لکھے ہیں، حالانکہ یہاں کا لکھنا بھی صرف ایکٹ کرنا ہے۔ جس کو زمین والے سمجھ ،

ہی نہیں سکتے، کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے) بہرحال ہمارے ملک کی زندگی تو بالکل حرکت وعمل ہے، جب کوئی شخص کسی کام کو کرنے لگتا ہے۔ تو ہم سمجھتے ہیں۔ کہ یہ کچھ کر رہا ہے۔ ورنہ اس سے قبل ہم سمجھ ہی نہیں سکتے تھے کہ کوئی کیا کرنے والا ہے۔ برخلاف اس کے زمین والوں کی زندگی میں یہ بات نہیں ہے۔ ان کے ہاں کی زبان کچھ اور ہے اور حرکات و اعمال کچھ اور، سب سے پہلے جب وہ کسی کام کو کرنا چاہتے ہیں تو اس کا ارادہ کرتے ہیں (ارادہ کیا ؟ اس کا سمجھانا ذرا مشکل ہے، بس یوں سمجھ لینا چاہیئے کہ جب تک وہ کسی کام کو کرنا نہیں چاہتے ہیں وہ صرف ارادہ کہلاتا ہے) اس ارادہ کا اظہار اپنی زبان سے کرتے ہیں (اعضا سے کوئی تعلق اس فعل کا نہیں ہوتا جس کا ذکر وہ زبان سے کر رہے ہیں) اور کرتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ وہ قوت جو تحریک جوارح میں صرف ہونی چاہیئے تھی صرف کہنے میں صرف ہو جاتی ہے۔ اور وہ انسان بیٹھ جاتا ہے، اسی کا نام ان کے ہاں سعی و کوشش بھی ہے مثلاً ایک شخص پانی پینا چاہتا ہے۔ یا کہیں جانا چاہتا ہے۔ تو وہ پہلے اس فعل کا خیال اپنے دل میں کرے گا۔ اسے بار بار زبان سے کہے گا (جس کو وہ ارادہ سعی و کوشش کہتے ہیں)، اور پھر کہیں جا کر مشکل سے اس کو کرے گا،

ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔ جب کوئی کام ہو جاتا ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہونے والا تھا۔ ہرچند یہ حرکات ہماری بالکل اضطراری ہوتی ہیں۔ اور ہمارے ملک والے فطرتاً اس طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ تاہم زمین والے بھی اس پر مجبور ہیں۔ کہ وہ کسی کام کو کریں نہیں، بلکہ صرف اس کا زبانی ذکر کیا کریں۔ اور یہی وہ خاص بات ہے جس نے ایسا تباین ہم میں اور ان میں پیدا کر دیا ہے

وہی مجموعۂ تعلیمات جس کو زمین والے قرآن کہتے ہیں۔ ہمارے لیے بھی ہے اور اسی پر ہمارا عمل ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ ہمارے ہاں اس کا اعلان محض حرکات

سے کیا گیا۔ اور زبن والوں میں زبان سے ہی یعنی ان کو بتایا بھی گیا۔ اور سکھایا بھی گیا۔ لیکن چونکہ وہ مخلوق الفاظ سے زیادہ کام لیتی ہے۔ اس لیے اس نے سمجھا۔ کہ اس مجموعہ کو صرف پڑھنا۔ اور پڑھتے رہنا۔ اصل مقصود ہے اور کچھ نہیں۔ حالانکہ یہ اُنکی سخت غلطی ہے فرض کرو۔ کہ وہ لوگ زبان سے تو کہتے ہیں کہ ایک دوسرے سے ملے جلے رہو۔ اخلاق کو پاکیزہ بناؤ۔ اور حال یہ ہے۔ کہ وہ ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ اور اخلاق بدستور ویسے ہی گندے ہیں پھر کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ اس مجموعہ تعلیمات سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ ایک شخص کتاب میں یہ پڑھتا ہے۔ کہ جب دو چیزیں آپس میں رگڑ کھاتی ہیں۔ تو آگ پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اگر اس کو آگ پیدا کرنے کی ضرورت ہو۔ اور وہ دو پتھر کے ٹکڑوں کو لے کر صرف یہی سنایا کرے کہ "جب دو چیزیں رگڑتی ہیں تو آگ پیدا ہو جاتی ہے" تو کیا یہ ممکن ہے۔ کہ وہ پتھر کے ٹکڑے یہ سنکر از خود رگڑ کھا جائیں گے، اور آگ پیدا کردینگے اس قوم کے واعظین کا بالکل یہی حال رہا۔ اُنھوں نے ہمیشہ اخلاق کی تعلیم دی لیکن خود اُنھوں نے اپنے اخلاق کبھی درست نہیں کئے۔ حریت و آزادی کا راگ ہمیشہ گایا گیا لیکن اُنھوں نے اپنی روح کو کبھی اس قید سے آزاد نہیں کیا۔ جو ہمیشہ عصیان اور فسق و فجور کی صورت میں ان کو جکڑے رہی

اُنھوں نے زبانوں سے تو کہا۔ کہ ہم تمہارے بہی خواہ دوست اور ہمدرد کیا کیا ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُنھوں نے کبھی خیر خواہی نہیں کی کبھی دوست نہ ہوئے اور کسی وقت ان کے دلوں میں اپنے ابنائے جنس کی طرف سے ہمدردانہ محبت پیدا نہیں ہوئی۔ اور یہ تماشہ ہے کہ خود اس جماعت کے اکثر افراد نے ایک وقت میں اسکو اچھی طرح محسوس کر لیا لیکن تاہم بھی وہ کچھ نہیں کر سکے،

اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ ہر شخص دنیا کو صرف اپنے وجود سے وابستہ سمجھتا تھا یعنی وہ سمجھتا تھا کہ میں ہی نوع انسان ہوں۔ اور ایک وقت معینہ کے بعد مر کر چلا جاؤں گا،

ضرورت کیا ہے کہ ان جھگڑوں میں پڑوں۔ اور خواہ مخواہ کا درد سر مول لوں۔ وہ لوگ اس سے واقف ہی نہ تھے۔ کہ اجتماعی زندگی ملی حیات، قومی محبت و یگانگت کیا چیز ہے اور ایک حقوق دوسرے پر کس قدر ہیں اگر کوئی اصلاح کا دعوے لے کر اٹھتا تھا۔ تو اس کا مدعا واقعی اصلاح نہ ہوتا تھا۔ بلکہ صرف ذاتی غرض کا پورا کرنا مقصود ہوتا تھا۔ اور وہ غرض کسی کی تو یہ ہوتی تھی۔ کہ دولت حاصل کرے، کوئی صرف ناموری چاہتا تھا۔ کوئی صرف حکومت اور ارباب حکومت کے ہاں رسوخ پیدا کرنے کا خواہشمند ہوتا تھا الغرض ہر شخص اپنی جگہ ایک مستقل غرض بن گیا۔ اور دوسروں کی طرف سے بالکل مستغنی و بے پرواہ۔ دلوں سے درد سینوں سے گداز جاتا رہا، اور اسطرح وہ تنہا ذریعہ جو قرآن پر عمل کرانے میں معاون ہو سکتا تھا۔ ہاتھ سے نکل گیا۔ یوں تو مسجدیں آباد نظر آتی تھیں۔ پیشانیوں پر سجدوں کے نشان بھی دور سے نظر آتے تھے، صورت بھی ہر طرح مردم فریب تھی۔ لیکن ان کے یہ اعمال بھی حقیقی روح عمل کے مقابلہ میں ویسے ہی تھے جیسے انکی زبان اقوال اعمال کے مقابلہ میں، جسطرح وہ محض زبانی ذکر کر کے اپنے اندر کوئی ولولہ عمل کا پیدا نہ کر سکتے تھے۔ اسی طرح وہ عمل کر کے بھی روح عمل کو نہ پا سکتے تھے اور اس کی وجہ یہی تھی۔ کہ وہ بغیر کئے ہوئے سب کچھ حاصل کر لینا چاہتے تھے۔ اور بغیر چلے ہوئے منزل مقصود تک پہنچ جانے کی تمنا رکھتے تھے، انھوں نے نمازیں پڑھیں صرف اس لئے کہ ایسا کرنے کا حکم ہے۔ حالانکہ انھوں نے اسپر غور نہیں کیا۔ کہ صرف چند بار اٹھنے بیٹھنے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ اگر اس کی حقیقی کیفیت طاری نہ ہوئی۔ سو اس کا کہیں کوسوں پتہ نہ تھا، اور انکی حالت بعینہٖ اس بیل کی سی تھی۔ جو رات دن چلتا تو ہے۔ مگر رہتا ہے کولھو کے آس پاس،

میں یہ نہیں کہتا۔ کہ زمین والے اس کے اہل ہی نہ تھے۔ تھے اور اب بھی ہیں۔ لیکن وہ ترقی اسوقت کر سکتے ہیں۔ جب رسول اللہ کی تعلیمات کو پیش نظر رکھیں

اور کوئی قدم اس کے خلاف نہ اٹھائیں۔ وہ زبان سے نہ کہیں کہ تعلیمات کیا ہیں۔ وہ صرف زبانی دوسرے کو نہ سمجھائیں۔ کہ ان کا کیا مقصود ہے۔ بلکہ اسپر عمل کریں۔ اور خود عمل کرکے دوسروں کو بتائیں۔ لیکن ایسے اس کی امید رکھنا فضول ہے۔ مجھہ میں انکی حالت دیکھہ کر کیا کیا جوش پیدا ہوا۔ اور کیسا کیسا جی کڑھا۔ لیکن کوئی صورت نہ تھی کہ میں ان کو بتاتا۔ اور اپنے مافی الضمیر سے ان کو آگاہ کرتا۔ کیونکہ میرے ہاں مافی الضمیر ظاہر کرنے کا طریقہ صرف ایکشن دعمل ہے۔ اور وہ اس کے عادی نہیں ہیں خاموش ہو رہا کیا کر سکتا تھا۔

کہ اے برادران وطن میں تمہیں آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ کہ ہمیشہ اسوقت سے پناہ مانگنا جب تمہارے دلوں میں قبل کسی کام کرنے کے صرف ارادہ پیدا ہو۔ کہ اس ارادہ اور اس تفریق نے ہندوستان کی ایک بڑی اور زبردست قوم کو بالکل تباہ وبرباد کر ڈالا۔

پانچواں صفحہ

میں برادران وطن کے سامنے اس وقت تک وہ اپنی تمام معلومات نہیں پیش کرسکا جو میری ناچیز سیاحت کے زمانہ میں مجھے حاصل ہوئیں۔ اور جنکا اظہار میں ہر اس قوم کے لیئے مفید خیال کرتا ہوں جس کو اگر ترقی کا خیال نہیں ہے تو کم از کم وہ فنا ہو جانے کو بھی پسند نہیں کرسکتی۔ لیکن قبل اس کے کہ میں اصل مدعائے سخن کا آغاز کروں۔ بصورت تمہید اتنا عرض کردینا ضروری خیال کرتا ہوں۔ کہ کائنات کا ہر واقعہ عام اس سے کہ وہ کسی ترقی یافتہ قوم سے متعلق ہے یا وحشی طبقہ سے ہمارے لیئے صرف ایک پہلو توجہ والتفات کا رکھتا ہے، اور وہ پہلو وہی ہے۔ جسپر غور کرنا تو آسان ہوجایا کرتا ہے۔ لیکن نتیجہ تامل پر عمل کرنے کے لیئے ہمیشہ کاہل وغافل ثابت ہوتے ہیں۔ یاد رکھو۔ کہ عالم میں اس سے زیادہ سہل کوئی بات نہیں۔ کہ ایک قوم محض اپنے اطوار و

کردار کیوجہ سے کوئی نمایاں ترقی کرے۔ اگر وہ اس کی اہل ہے کہ وہ اپنی قوت تمیز کو کام میں لاکر صالح کو فاسد سے جدا کرسکے، لیکن تجربہ ثابت کرتا ہے۔ اور تاریخ شاہد ہے کہ یہی سب سے زیادہ دشوار امر ہے، ہماری ضروریات انقلابات دہر، اتفاقات زمانہ ہمیں اپنے مرز بوم سے جدا کرکے کسی ایسی جگہ لے جاتے ہیں، جو ہمارے لیئے بالکل بیگانہ ہے، اور اول اول ہمیں وحشت ہوتی ہے۔ کہ ہم کیونکر یہاں زندگی بسر کرسکیں گے لیکن رفتہ رفتہ وہ وحشت کم ہوتی ہے۔ اور ہوتی جاتی ہے، یہانتک کہ ایک ربع صدی کے اندر ہی اندر سارے مدارج طے ہوجاتے ہیں، اور دیکھا جاتا ہے کہ ہم سے زیادہ داد دینے والا۔ ہم سے زیادہ قدر کرنے والا۔ ان حقائق و عادات کا کوئی نہیں ہے جن سے زمانہ نے ہمارا تعارف کرایا تھا،

میں یہ نہیں کہتا۔ کہ یہ امر خلاف فطرت ہے، نہیں بلکہ یہ عین اقتضاء فطرت ہی لیکن ہم کو یہ کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ فطرت کا کوئی اقتضاء طبیعت و مزاج کا کوئی میلان، ایسا نہیں ہے۔ جو ہمارے ضمیر، ہماری فکر، ہمارے غور و تامل کے حیطۂ اقتدار سے باہر ہو۔ یہ ہماری سخت کمزوری ہے۔ کہ کسی امر کے اختیار کرنے میں اپنی ذہانت و تدبر کو صرف اس حد تک استعمال کرتے ہیں جس حد تک ہماری خواہشات نفس ہمارے داعیات قلب کو صدمہ نہیں پہنچتا، مثلاً اس لیئے یقیناً یہ امر خطرناک ہوگا۔ کہ میں کسی ملک یا کسی قوم کی تاریخ تنزل اپنے ملک والوں کے سامنے بیان کروں۔ بغیر اس کے کہ میں پہلے اس بات کو اچھی طرح سمجھادوں۔ کہ یاد رکھو۔ کہ کوئی نئی بات اختیار کرنے کے قابل نہیں۔ جب تک اس کے نتائج کیطرف سے ہمیں اطمینان کلی حاصل نہ ہوجائے خواہ اس کے ظاہری اثرات کتنے ہی دل خوش کن کیوں نہ ہوں، یہ امر مسلمات میں سے ہے کہ ایک معصوم کے سامنے معاصی کی برائیاں بیان کرنا خوب نہیں۔ کیونکہ اسطرح حقیقۃً اس کے معلومات میں ایسی باتوں کا اضافہ کرنا ہے۔ جن سے وہ بالکل آشنا نہیں۔ اور

بالکل ممکن ہے۔ کہ فطرت وطبیعت جو متجس واقع ہوئی ہے۔ جو ہر نئی بات کیطرف راغب ہوجاتی ہے۔ اس کو ان ہی معاصی میں آلودہ کردے جن کی برائیاں اس سے بیان کی جاتی ہیں

چنانچہ آپ لوگونکو یہہ معلوم کرکے سخت حیرت ہوگی۔ کہ قانون کیا چیز ہے ہمارے ملک میں نہ کوئی قانون ہے نہ تعزیرات اور یہی وجہ ہے کہ یہاں وہ جرائم ہوتے ہی نہیں جنکا ذکر اور ممالک کے قانون میں ہے۔ اور جن کو خود قانون نے رائج کیا ہے ایک وحشی قوم جو تمدن سے آشنا نہیں ہے جس کو معاشرت کی ترقی کی ہوا نہیں لگی، یقیناً اس کی فطری سادگی۔ اور جبلی معصومیت فنا ہوجاے گی۔ اگر اس کو یہ بتایا جاے گا کہ دیکھو چوری نہ کرنا۔ جھوٹ نہ بولنا۔ اس علم سے ان کے دماغ کو ایک نئی بات حاصل ہوگی۔ اور وہ معلوم کرینگے کہ ایسا ہی دنیا میں ہوتا ہے۔ اور اس لیئے بالکل ممکن ہے کہ کسی وقت وہ جھوٹ ہی بولنے لگے، اور چوریاں بھی کرنے لگے،

اس لیئے میں اپنے ملک والوں کے سامنے اپنے واقعات سیاحت بیان کرتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ کہ کہیں ان میں وہ جدید باتیں نہ پیدا ہوجائیں، جن سے وہ آشنا ہی نہیں ہیں اور جنکا وجود یا امکان وجود ان کے نزدیک بالکل حالت انعدام میں ہے۔ لیکن کیرکٹر (سیرۃ) کی اس مضبوطی کا خیال کرتے ہوئے جو میرے برادران وطن میں پائی جاتی ہے اور اس ترقی کو دیکھتے ہوئے جو نہایت صحت مذاق اور دقت نظر کے ساتھہ ہمارے ملک نے اس وقت تک حاصل کرلی ہے۔ میں یہ جرات کرتا ہوں۔ اور بیان کرنا چاہتا ہوں کہ کرۂ ارض میں یہ عدم مساوات۔ یہ نشیب وفراز۔ یہ بوقلمونی یہ نیرنگی۔ یہ تقسیم حال کیوں ہے۔ میں اس سے قبل کافی شرح وبسط کے ساتھہ بیان کرچکا ہوں۔ کہ اس کرہ میں ایک خاص ملک ہندوستان میں کیا کیا انقلابات ظہور پذیر ہوئے، اور اوران کے اسباب کیا تھے۔ میں یہ بھی اسی ضمن میں بیان کرچکا ہوں۔ کہ وہاں کی تعلیمی

سیاسی، اور معاشرتی حالت نے کن اثرات کے زیر اثر انقلاب کو قبول کیا، اور رفتہ رفتہ وہ کس حد تک پہنچ گئے، لیکن میں اس حصہ میں صرف ان تدابیر کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جن سے بہت کچھ تلافی مافات ہو سکتی ہے، اگر ہند کی قوم چاہے۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی مقصود ہے کہ اگر میرے برادران ملک کو خدانخواستہ کبھی ان تدابیر کی ضرورت پڑ جائے تو وہ آسانی کے ساتھ اختیار کر سکیں

یہ تو آپ حضرات کو معلوم ہو چکا ہو گا۔ کہ ہند کی تنہا خدا پرست قوم نے کسقدر اپنے کو ذلیل کر لیا ہے۔ اور اب اس کے لیئے کسقدر دشواریاں ہیں۔ تاہم اگر وہ کوشش کریں۔ اور ان تدابیر پر غور کریں جن سے ان کا صحیفہ آسمانی لبریز ہے تو اب بھی وہ [illegible] کر سکتے ہیں۔ مجھے سخت حیرت ہوئی۔ جب میں نے دیکھا۔ کہ باوصف اس ادعائے کہ وہ خدا پرست ہیں۔ باوصف اس نخوت پندار کے کہ عالم میں صرف انہی کا مذہب راستی کا حامل ہے۔ ان سے زیادہ مشرک، ان سے زیادہ خدا کی توہین کرنے والا۔ ان سے زیادہ کجرو۔ ان سے زیادہ رہ راست سے ہٹا ہوا۔ اور کوئی نہیں ہے ان کے مذہب نے انہیں صداقت کی تعلیم دی۔ مگر انہوں نے اس سے یکسر انحراف کر لیا ان کے دین نے ان کو محنت و جانفشانی کا درس دیا۔ لیکن ان سے زیادہ کاہل و غافل اور کوئی نہیں ہے۔ ان کے بانی مذہب نے اپنے وجود کے ذریعہ سے ایک نہایت مکمل اور سچا نمونہ انسانیت کا پیش کیا۔ لیکن اس خودسر قوم نے ان خصوصیات کو بالکل فراموش کر دیا۔ اور صرف یہ ہی نہیں کیا۔ بلکہ دوسری اقوام کے عادات و اطوار اس نے اختیار کر لیئے اور کبھی اس نے خیال بھی نہیں کیا، کہ ایک قوم سے مراد صرف اس کے خصائل ہیں۔ اور کچھ نہیں،

سب سے پہلی چیز جس کو اس نے ترک کیا۔ معاشرت کی سادگی تھی۔ حالانکہ مذہب کے زمانہ ابتدائی میں جس کو انتہائے عروج کا زمانہ کہنا چاہیئے۔ یہی ایک خصوصیت تھی

جسکا اثر۔ صرف اس کی معاشرت پر پڑتا تھا۔ بلکہ اقتصادی حالت اور سیاسی زندگی
بھی اس کے زیر اثر اپنا کام کر رہی تھی۔ بانی مذہب کے بعد تھوڑا ہی زمانہ گذرا تھا۔ کہ اس
قوم کی سادگی رفتہ رفتہ بالکل معدوم ہو گئی۔ اور ان میں وہی دور از کار تکلفات
معیشت و حیات پیدا ہو گئے جنکا اثر اس وقت تک تو کچھ بہت زیادہ معلوم نہیں ہوا
لیکن آگے چل کر پتہ چلا۔ کہ یہ ایک سخت مرض تھا جسکا انجام ہلاکت اور صرف ہلاکت
ہی ہو سکتا ہے

وہ سر جو صرف ایک معمولی دستار کے نیچے ہزاروں مسائل حکمیہ اور رموز
مملکت سمجھ لیا کرتے تھے زر اندود مطلا و بیہم کے ساتھ اس قابل بھی ثابت نہ ہوئے
کہ وہ صرف اس تاج کی عزت قایم رکھ سکتے، چہ جائیکہ کوئی پیشقدمی کرتا۔

وہ تن جو ایک سادہ ملبوس۔ ایک معمولی قبا کے اندر سرعت برق کو شرماتے
تھے، مکلف عباؤں اور جواہر کار لباسوں کے ساتھ اس حرکت جسم کو بھی کھو بیٹھے
جو صرف اپنا پیٹ پالنے کے لیے ضروری تھی،

کام سے پہلے ہی انسان کا جسم تھک جاتا تھا۔ افکار و غور و تامل سے پہلے ہی انسانی
دماغ خستہ و مضمحل ہو جایا کرتا تھا۔ لیکن اس کا ازالہ فرش خاک پر، پتھر کی چٹانوں
پر آسودگی کے ساتھ محو خواب ہو جانا تھا۔ اور کچھ نہیں۔ دن کی خستگی دور کرنے کے
لیے صرف وہ رات کے اطمینان و سکون کو کافی سمجھتے تھے۔ وہ آسمان کی نیلگوں گہرائی
میدانوں کی سادگی و ہمواری جگمگاتے ہوئے تاروں کی ٹھنڈی روشنی، اور مہتاب
کی خنک رعنائیوں کو دیکھتے۔ اور وہ کچھ سکون و تازگی اس سے حاصل کر لیتے۔ کہ
صبح کو وہ اپنے اندر ایک نئی روح پاتے، اور پھر اسی جوش و خروش کے ساتھ اپنے
اپنے کاموں میں لگ جاتے،

لیکن جب مناظر فطرت سے کسب سکون کا رواج ان میں باقی نہ رہا۔

جب ان قدرتی ذرائع کو انہوں نے اضمحلال وحشتگی دور کرنے کے لیئے ناکافی سمجھا تو ان کا وقت بہت کچھ اس فکر میں ضایع ہونے لگا۔ کہ کیونکر یہ حرص پوری کی جاسکے اس میں شک نہیں کہ اس کا نتیجہ یہ تو ضرور ہوا کہ دنیا میں بہت سی نئی باتیں پیدا ہو گئیں لذتوں کے ذرایع۔ مشاغل تفریح کے اسباب بہت کثرت سے رونما ہونے لگے لیکن اس کے ساتھہ انہوں نے اپنی اس وحشت وعصبیت اور اس سادگی و آزادی کو بھی خیرباد کہدیا۔ جو ایک قوم کی ترقی کا حقیقی راز ہے۔ پہر بھی یہ سراسر نہیں ہوا۔ کہ کسی حد تک جاکر وہ بندگان لذت ومسرت بس کرتے۔ بلکہ اُنکی حرص اور بڑہتی گئی۔ اور انکا سارا وقت اسی میں صرف ہونے لگا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ رفتہ رفتہ اسمیں ضعف ہونے لگا۔ اور وہ غفلت کی حالت بڑہ گئی جو ظاہر میں امن وسکون ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو اسمیں سکون موت ہے، اور امن فنا میں اگر آپ لوگوں کے سامنے بیان کروں۔ کہ ان کے مشاغل تفریح کیا ہیں وہ کسطرح اپنا وقت بسر کرتے ہیں، تو آپ لوگوں کو حیرت ہو جائیگی۔ اور قیامت تک آپ کی سمجھہ میں نہ آئے گا۔ کہ یہ کیا بلا ہے۔ مثلاً ایک شخص کے ہاں شادی ہوتی ہے، تو وہ اظہار مسرت میں سب سے پہلے جس چیز کیطرف توجہ کرتا ہے وہ رقص وسرود ہے آپ رقص وسرود کو نہ سمجھیں گے۔

یہ گفتگو کا ایک خاص طریقہ ہے جس کے لیئے خاص طور سے گلا تیار کیا جاتا ہے، اور ایک ایک لفظ بہت کہا پھر اکر آواز کو اونچا نیچا کرکے گہٹا بڑھا کے اور کھینچ تان کے نکالا جاتا ہے، اور اسی آواز کے ساتھہ جسم کو حرکت دی جاتی ہے، کمر میں بل پیدا کیئے جاتے ہیں، پہر اس کے ساتھہ اور بہت سی چیزیں ہوتی ہیں، جن کو ساز کہتے ہیں اور جو اس آواز کا ساتھہ دیتے ہیں، یہ خدمت اکثر وبیشتر عورت کے سپرد کی جاتی ہے اور وہ بھری محفل میں یہ حرکتیں کرتی ہے، اس عورت کو مغنیہ اور رقاصہ کہتے ہیں جو دولت کما بہت ...کرتے آوازیں اپنے گلے میں پیدا کرتی ہے، اپنے دوران سیاحت میں میں نے

اپنے کانوں سے ان آوازوں کو سنا۔ اپنی آنکھوں سے ان حرکات کو دیکھا لیکن آپ یقین کریں۔ کہ میں ایک منٹ سے زیادہ نہ سن سکا، نہ دیکھ سکا۔ میرے کانوں کو سخت تکلیف پہنچی، اور میری بینائی کو اسیقدر ایذا،

میری سمجھ میں کسیطرح یہ بات نہ آئی کہ آخر انہیں اس میں کیا لطف آتا ہے محض آواز کے لیے جو قدرت کیطرف سے مفت عطا ہوئی ہے۔ یہ لوگ بیدریغ اپنی دولتیں لٹا دیتے ہیں۔ مگر نہیں وہ ایسا کرتے ہیں۔ اور تباہ ہوتے ہیں، جائدادیں فروخت کرینگے قرض لیں گے۔ مگر یہ بگاڑی ہوئی آوازیں ضرور سنیں گے۔ مذہب نے اس کی سخت ممانعت کردی اور ان کے بزرگوں کے عہد میں کبھی اس کا رواج نہیں ہوا۔ لیکن دوسری قوموں سے مل کر انہوں نے اس کو سیکھ لیا۔ اور عادی ہوگئے،

ایک بات اور دیکھی، ہمارے ہاں تو جنب یہ نظام ہے کہ جب کوئی مرجاتا ہے تو وہ غائب ہوجاتا ہے۔ اور پتہ نہیں چلتا۔ کہ وہ کہاں گم ہوگیا۔ ممکن ہے کہ وہ ہوا میں مجاتا ہو، جیسا کہ بعض حکما مریخ کا خیال ہے، بہر حال جو کچھ ہو۔ ہم مرجانے والے کے لیے سوائے اس کے اور کچھ نہیں کرتے۔ کہ اس کے صفات اور خصوصیات کو اپنی یادوں میں قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اور اس کے لیے جو کچھ بھی صرف ہو۔ ہم گوارا کرتے ہیں لیکن ہندوستان میں یہ دستور نہیں ہے۔ وہاں جب جسم کو زمین کے اندر حفاظت سے رکھدیتے ہیں۔ تو پھر انکی ساری کوشش اس میں صرف ہوتی ہے کہ سب سے بہتر طریقہ مردہ کی روح کو تکلیف پہنچانے کا کیا ہے۔ وہ اس کی جمع کی ہوئی دولت کو فضول مراسم میں ضایع کرتے ہیں۔ یہانتک کہ اولاد بعض اوقات بالکل غریب اور مفلس رہجاتی ہے، تعلیم و تعلم کا کیا ذکر۔ کہ اس کا وہاں وجود بھی نہیں ہے۔ اگر ہے تو صرف عورتوں کے طبقہ میں۔ اور وہ بھی صرف اسیقدر جو ان کے تباہ و برباد کرنے کے ضروری ہو،

الغرض ان کے جو عادات و خصائل بھی ہیں۔ سب اسی انداز کے ہیں۔ اور
ان کو مطلق باک نہیں ہوتا، کہ وہ اپنے تئیں خود تباہ کر ڈالیں۔

دوسری وجہ جو اس سے کم حاج نہیں ہے۔ ان کا فنون صنعت و حرفت سے بیگانہ
ہونا ہے۔ ان کے ہاں سب سے بڑا ذریعہ کسب معاش کا "ملازمت" ہے، یہ بھی
ہمارے برادران ملک کے لیے بالکل نئی چیز ہے۔ ملازمت کہتے ہیں۔ اپنے وقت کو دوسرے
کے ہاتھ فروخت کر ڈالنا، اور نہ صرف وقت کو بلکہ اپنے جسم کو اور روح کو،

خریدار کو اختیار ہوتا ہے کہ جس طرح چاہے کام لے، اور اس کو خلاف ضمیر کام
کرنے پر بھی مجبور کرے، اس کا جو کچھ معاوضہ ملتا ہے وہ بہت کم ہوتا ہے، لیکن وہاں
کے رہنے والے اس غلامی کے لیے جان دیتے ہیں۔ اور اس کو سب سے بہتر خیال
کرتے ہیں۔ چونکہ ہمارے ہاں یہ رواج بالکل مفقود ہے، اس لیے غالباً میں کسی طرح
نہ سمجھا سکوں گا۔ کہ واقعی نوکری یا ملازمت کیا چیز ہے، بس اس کو اسطرح سمجھ لو۔ کہ
جیسے کسی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈال دیا جائے۔ پھر اسی کے ساتھ سب سے بڑی مصیبت یہ ہے
کہ ضروریات زندگی کے لیے ہر شخص کو دوسرے کا محتاج بننا پڑتا ہے۔ ہمارے ہاں تو یہ رسم
ہے کہ ہر شخص اپنی ضروریات زندگی کو خود مہیا کرتا ہے یعنی پیدا کرتا ہے ہم خود ہی غلہ پیدا
کرتے ہیں۔ اور کھاتے ہیں۔ اور خود ہی کپڑا بنتے اور پہنتے ہیں، لیکن وہاں یہ دستور ہے
کہ ضروریات مہیا کرنے کے لیے ایک خاص چیز بنائی گئی ہے۔ جس کو روپیہ کہتے ہیں،
اور اس کی قیمت فرض کر لی گئی ہے جس سے ان اشیا کی فراہمی میں مدد لی جاتی ہے،
ملازمت کرنے والے خود بھی اپنی غلامی کا عوض اس روپے کی صورت میں پاتے ہیں،
اور خود دوسروں کو بھی اپنی ضروریات کے لیے یہی دے دیتے ہیں۔ اس سے نہ صرف
یہ نقصان ہے کہ نفع غلامی یوں مفت دربکار ضائع جاتا ہے۔ بلکہ انسان بدستور دوسرے
کا محتاج دست نگر بنا رہتا ہے، کرۂ ارض اور علی الخصوص ہندوستان میں تقسیم

عمل نے ایسی بری صورت اختیار کرلی ہے کہ قوم کی قوم اپنی ذہانت کو کھو بیٹھی ہے اور وہ قوتیں جو قدرت کی طرف سے مختلف کاموں کے لیے عطا ہوئی ہیں. بیٹھ کر رہ جاتی ہیں۔ اور انسان کے غیر محدود ذرایع کسب واکتساب فنا ہوجاتے ہیں میں یہ نہیں کہتا. کہ ہندوستان کی قوموں میں ذہانت کی کمی ہے یا وہ اس کے اہل نہیں ہیں یقیناً وہ ہم سے زیادہ اہل ہیں۔ اور ہم سے بہت زیادہ ذہین ہیں۔ لیکن فرق یہ ہے کہ وہ کچھ کرتے نہیں، اور ہم سب کچھ کرنا چاہتے ہیں، وہ غافل ہیں اور ہم ہوشیار وہ کاہل ہیں اور ہم مستعد،

میں یہ بیان کرچکا ہوں۔ کہ کرۂ ارض میں مسلمانوں کے انحطاط و زوال نے کیونکر تدریج کے ساتھ وہ تمام مراحل طے کیے ہیں، اور اب اُنکی حالت کیا ہے، اور اس کے بعد میں نے ان تدابیر کا ذکر کرنا شروع کیا تھا جن سے وہ قوم اپنے تئیں فنا ہونے سے بچا سکتی ہے، لیکن وہ تدابیر انہیں اسباب زوال سے متعلق ہیں کیونکہ ایک ایسی قوم کے لیئے جو زمانہ میں اسقدر گر گئی ہو۔ قابل غور امر یہ نہیں ہوتا۔ کہ وہ کیونکر ترقی کرے، بلکہ سوال صرف یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ کیونکر اپنے موجودہ وزن کو قایم رکھ سکے۔ ایک مریض کے حق میں اولین تدبیر صحت یہ ہے کہ اس کی حالت اور زیادہ ردی نہ ہونے پائے، اور اس کا مرض ایک جگہ قایم ہوجائے۔ جو شخص بستر مرگ پر ہے وہ اُٹھ کھڑا ہو، یہی غنیمت ہے۔ چلنے پھرنے کا خیال کسے ہوتا ہے، پس ہمیشہ ایسی صورتوں میں تمام تدابیر متعلق ہوتی ہیں اسباب زوال وانحطاط سے جسطرح اسباب مرض کا دفع ہوجانا مریض کی شفا ہے، اسیطرح اخلاق کی صحت ایک قوم کی صحت ہے، کیونکہ قوم کا ذلیل و برباد ہونا کچھ نہیں ہے۔ مگر اس کے اخلاق کا بگڑ جانا۔ اور صفات قومی کا معدوم ہوجانا۔ اس لیئے اگر کوئی شخص کسی قوم کی حالت کو درست کرنا چاہتا ہے۔ اور وہ اس کی اخلاقی حالت سے بے خبر ہے، سب سے پہلے اسطرف توجہ نہیں کرتا۔ تو سمجھ لو

رہ دیوانہ ہے اس کی کوششیں سب بے کار، وہ نہیں سمجھتا کہ کس چیز نے یہ انقلاب پیدا کیا۔ اور اس کو ان اصول کی خبر نہیں، کہ علت کا فقدان معلول کا فقدان اور اسباب کی برہمی کا نتیجہ انہدام ہے۔ سب سے بڑا اور حقیقی سبب میں اس قوم کے فنا ہو جانے کا بیان کر چکا ہوں کہ وہ ترک مذہبیت ہے۔ مذہب نہیں ان میں مذہب تو ہے، وہ مدعی بھی ہیں۔ کہ اسلام ان کا دین ہے، اور اس میں کوئی گفت گو نہیں ہو سکتی۔ لیکن مذہبیت انکی مفقود ہوگئی ہے یعنی اقتضائے مذہب، داعیات دین اور حسیات قومی کیطرف سے انہوں نے یکسر روگردانی اختیار کر لی ہے۔ اور اس سے اس قدر بیگانہ ہو گئے ہیں۔ کہ اب ان کے نزدیک مذہب کا حقیقی مفہوم سوائے اس کے اور کچھ نہیں رہ گیا ہے۔ کہ وہ اپنے تئیں صرف مسلمان کہتے ہیں، اور اگر ان سے پوچھو کہ اسلام کیا ہے۔ تو یقیناً وہ تمہارا منہ حیرت سے تکنے لگیں گے۔ کہ یہ کیا سوال ہے، ہمارے باپ دادا مسلمان تھے پیرو اسلام کہلاتے تھے۔ ہم انکی اولاد ہیں۔ اس لئے مسلمان ہیں، اور ہونا چاہیئے۔ بہرحال میں اسکو پہلے بیان کر چکا ہوں۔ لیکن اب میں اس کے جزئیات سے بھی ایک مختصر سی بحث کرنا چاہتا ہوں۔ کہ فقدان مذہبیت کے کیا کیا اثرات نتیجہ تھے،

سب سے پہلے حکومت کو لو، یہ میرے برادران ملک کو اچھی طرح معلوم ہو گا۔ کہ عالم میں سوائے مسلمانوں کے کسی قوم کا مذہب ایسا نہیں جو سلطنت و حکومت کے لیئے اس سے زیادہ موزوں ہو۔ اور اس کے لیئے مجھے کسی طویل بحث کی ضرورت نہیں۔ تاریخ شاہد ہے زمانہ گواہ ہے کہ اسلام کی ابتدا سلطنت کی ابتدا تھی۔ اور مسلمانوں کی ترقی حکومت کی ترقی تھی لیکن وہ سلطنت کیا تھی، وہ حکومت کس انداز کی تھی۔ یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ سلطنت امن اور حکومت جمہوری کا مصداق صحیح سوائے ان کے اور کوئی نہیں ہوا اور نہیں کہا جا سکتا۔ کہ وہ ترقی کیسی ترقی ہوتی۔ اور وہ امن کیسا امن ہوتا۔ اگر مسلمان کم از کم پانچ صدی تک اپنے اصول مذہب کو ترک نہ کرتے۔ اور اپنے ہادی کی ڈالی ہوئی

بنیاد کو متزلزل نہ کر دیتے، اب میں بیان کروں گا۔ کہ سب سے پہلی وہ خرابی کیا تھی۔ جو اس قوم میں پیدا ہوئی جس وقت نبی آخر الزمان نے مبعوث ہو کر لوگوں کو تعلیم مذہب و تلقین دین کا کام شروع کیا۔ اس وقت اس کا نصب العین صرف یہ تھا۔ کہ لوگوں میں ایک غرض مشترک کا خیال پیدا کر دیا جائے۔ یعنی تمام افراد قوم کی خواہشوں کا مرجع ان کی تمام آرزوؤں کا ہدف تمناؤں کا آماجگاہ ایک اور صرف ایک قرار دیا جائے۔ چنانچہ وہ اس میں کامیاب ہوئے، اور اس نوع کا خیال لوگوں میں پیدا کر دیا۔ وہ خیال کیا تھا؟ وہ نصب العین کیا تھا؟ وہ غرض مشترک کیا تھی؟ وہ غرض مشترک صرف خدمت قوم تھی۔ یعنی ہر شخص اپنا فرض سمجھتا تھا۔ کہ وہ اپنے ابنائے جنس کی خدمت کرے۔ اور اپنی ذاتی اغراض کو بھول جائے۔ ان میں یہ مادہ پیدا کر دیا گیا تھا کہ بہ نسبت اپنی خواہشات کے دوسروں کی آرزوئیں پوری کر کے وہ زیادہ مسرور ہوں۔ یہ امر ان کے ذہن نشین کر دیا گیا تھا، کہ انسان محض اسی لیئے پیدا کیا گیا ہے۔ کہ دوسروں کے کام آئے، اور اپنے اغراض نفسانی پر دوسروں کی خواہشوں کو ترجیح دے،

غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جس سلطنت کی بنیاد اس خیال پر قائم ہو۔ وہ کیسی سلطنت ہو سکتی ہے، اور اس کی وسعت کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے، اور جس نظام حکومت کے ارکان اس خیال میں مستغرق ہوں۔ وہ کس قدر ترقی کر سکتا ہے تامل کرنے سے یہیں یہ بھی واضح ہو جائے گا۔ کہ جمہوریت کا صحیح مفہوم بھی اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے، جب کسی قوم کے افراد میں یہ خیال پیدا ہو جائے۔ کیونکہ ہر فرد اپنے پاک، اور بے لوث جوش خدمت کے لحاظ سے واقعی حق اس امر کا رکھتا ہے کہ وہ نظام حکومت میں برابر کا حصہ لے اور اس سچی آزادی اس حقیقی حریت کے ساتھ، جو صرف صداقت نفس سے پیدا ہو سکتی ہے ترقی قوم میں حصہ لے، اس کا نفع عظیم ایک طرف تو یہ ہوا۔ کہ سلامتی ضمیر اصابت رائے، صحت فکر، اور وقت نظر پیدا ہوئی۔ جو

تمدن کی انتہائی ترقی کا باعث ہوسکتے ہیں، اور دوسری طرف جمہوریت کے ساتھ وہ
اتفاق واتحاد قائم ہوا۔ جو سوائے اس صورت کے دوسری صورت میں ممکن ہی نہیں
جیسا کہ تاریخ بھی بتاتی ہے، کہ جب جمہوریت کی شان کسی حکومت میں پیدا ہوئی۔ تو
اسی کے ساتھ رفتہ رفتہ طوائف الملوکی بھی پھیلی اور اس طرح یہ جمہوریت کا شیرازہ منتشر
ہوگیا۔ لیکن چونکہ اسلام نے تمام افراد میں ایک غرض مشترک پیدا کردی تھی۔ اس
لیے انکی جمہوریت کیا۔ ایسا اتحاد تھا جس کی نظیر کہیں دنیا میں نہیں مل سکتی۔ اور انکی
آزادی ایک ایسا اتحاد تھا کہ کسی دوسری صورت میں پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ اور اس
طرح اسلام نے حقیقتاً دو متضاد و مخالف عناصر کو اس طرح سے ملا دیا، کہ وہ یک جزو
ہوکر رہ گئے، اور یہی وہ راز تھا جس کو اکثر تو سمجھ ہی نہیں سکے، اور جن قوموں نے
سمجھا۔ وہ کوئی تدبیر ایسی اختیار نہ کرسکے جو اسلام کیطرح اطاعت و حریت دونو کو باہم
ممزوج کرسکتے۔

الغرض سب سے پہلی برکت اسلام کی یہی تھی۔ اب دیکھئے، کہ رفتہ رفتہ اس میں
کسطرح کمی ہوتی گئی، اور اس نے کیا صورت اختیار کرلی۔ جب نبی آخر الزمان اپنی عمر طبعی
کو طے کرکے کرۂ ارض سے چلے گئے۔ تو ان کے بعد عہد خلافت شروع ہوا۔ یعنی ان کے
خاص خاص احباب و مشیروں میں عنان سیادت منتقل ہوئی ہرچند وہ خصوصیت اسی
عہد میں ضعیف ہو چلی تھی، لیکن چونکہ نبی آخر الزمان کے وصال کو ابھی زیادہ زمانہ نہ ہوا
تھا۔ اس لیے بہت کچھ اثر قائم تھا۔ اور دفعتہً وہ زائل نہ ہوگئی۔ جن لوگوں نے اسلام
کی تاریخ پڑھی ہے انہیں معلوم ہوگا۔ کہ رسول اللہ کے وصال کے بعد ہی دو گروہ ایسے پیدا
ہوگئے۔ جو انتخاب خلیفہ میں دو مختلف رائیں رکھتے تھے۔ میں یہ نہیں کہتا۔ کہ یہ اختلاف
سراسر اغراض شخصی پر منحصر تھا۔ لیکن بعض افراد یقیناً ایسے بھی تھے جن کے اندر یہ خیال
بھی کام کررہا تھا۔ اور ان کا اختلاف محض اسی بنا پر تھا۔ بہرحال ہوا وہی۔ جو

ہونا چاہیئے تھا۔ اور اسطرح اس نہاں عناد و اختلاف کا کچھ بس نہ چلا۔ جو بعض افراد
کے دلوں میں پایا جاتا تھا۔ لیکن زبان جمہور کے سامنے وہ بالکل ضعیف و مضمحل تھا
اس وقت تک۔ اسلام میں اس حکومت و سلطنت کی بنیاد نہ پڑی تھی جو آیندہ چل کر
قایم ہوئی اور جس نے اسلام کی تمام خصوصیات کو درہم برہم کر دیا۔ لیکن اس میں کلام
نہیں۔ کہ اس کے آثار نبی آخر الزماں کی رحلت کے بعد ربع صدی کے اندر ہی اندر
شروع ہو گئے تھے اور افسوس ہے کہ لوگوں نے ذرا توجہ اسطرف نہ کی۔ جب رفتہ
رفتہ ایثار و نفس کشی کا خیال مسلمانوں کی قوم میں ضعیف ہوتا گیا۔ تو اس کا لازمی
نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ہر شخص نفس پروری کے ذرایع تلاش کرے اور اسطرح اس سلطنت
کی بنیاد پڑی۔ جس کے بادشاہوں کا اخلاق گھٹتے گھٹتے اس درجہ پر پہنچ گیا جس کی
بہتر نظیر ہم کو سلطنت ایران کے اخیر عہد میں مل سکتی ہے۔ ان کو نہ ہر حکومت کی
خواہش رہی نہ سلطنت کی، بلکہ وہ بدترین خود غرضی پیدا ہو گئی جو شاید کرۂ ارض کے
حیوانوں میں بھی نہ ملے گی، اُنہوں نے اپنی عزتیں قربان کر ڈالیں صرف اس لیئے
کہ اس عزت کی قیمت انہیں ملتی تھی، اُنہوں نے خود اپنے مذہبی شعائر و دینی پیشواؤں
کی بے حرمتی گوارا کی، محض اس خیال سے کہ شاید چند سکے زائد اُن کی ہتھیلیوں میں آجائیں گے
اُنہوں نے اپنے عزیزوں، اپنے احباب کا خون بہایا۔ کیونکہ ایسا کرنے سے اُنہیں
بیسہ قرض مل سکتا تھا۔ الغرض ان بادشاہوں نے وہ سب کچھ کیا۔ جو ایک ذلیل
و حریص جانور کر سکتا ہے،

لیکن بایں ہمہ وہ اپنے مقاصد حاصل نہ کر سکے۔ مگر افسوس اسپر نہ تھا۔ کہ
اُنہوں نے ایسا کیا۔ بلکہ حسرت تو اس امر پر تھی۔ کہ دنیا کے مسلمانوں نے پھر بھی کوئی
سبق حاصل نہ کیا، اور وہ نہ سمجھے کہ دنیا میں کسی قوم کی عزت نہیں ہو سکتی۔ جب تک
خود اس کے اندر پندار خودداری نہ پایا جائے۔ اور یہ ممکن نہیں جب تک اغراض

نفسانی کی قربانی دوسروں کے لیئے نہ کر دیجائے، ہر چند اس دور کے بعد وقت ایسا
آیا تھا کہ مسلمانوں میں کچھ جد و جہد کے آثار نمایاں ہو رہے تھے، اور ایسا معلوم
ہوتا تھا۔ کہ شاید وہ سنبھل جائیں گے۔ لیکن زمانہ نے ثابت کر دیا۔ کہ وہ کوشش انکی
بالکل بے سود تھی۔ اور وہ اضطراب، اضطراب فنا تھا، جو معدوم ہونے کے وقت
رد عمل کے زیر اثر تمام سینوں میں پایا جاتا ہے

میں اس سے قبل ظاہر کر چکا ہوں۔ کہ وہ کوششیں کیا تھیں، جو مسلمانوں نے
کیں۔ اور وہ کس قدر بے اصول تھیں۔

تعلیم ان کی غلط اصول پر قائم ہوئی۔ سیاست میں انہوں نے اپنے ذوق ثانی
سے دھوکا کھایا۔ معاشرت وہ اپنی درست نہ کر سکے۔ اخلاق کیطرف ان کو توجہ نہ
ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے لاکھوں روپیہ علیگڑھ کالج میں صرف کیا۔ کہ بچے سود
تعلیم پڑھا لیں۔ لیکن جہل سے ایک قدم آگے نہ بڑھایا۔ اور ان کی دوسرے رقیب
تو بہت سب کچھ کر لیا۔ میں نہیں کہتا۔ کہ وہ اب کچھ نہیں کر سکتے۔ ان کا مرض علاج کو
گذر چکا ہے۔ لیکن اس میں بھی کلام نہیں کہ سخت دشوار اور بظاہر کوئی امید ان کے
سنبھلنے کی نہیں ہے۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا۔ کہ اپنے تمام دوران سیاحت میں
میں نے کسی قوم کو اس حالت غربت و ذلت میں بھی اسقدر قابل التفات نہ پایا۔ میرا
کبھی جی چاہا۔ کہ کاش یہ قوم میرے ملک میں ہوتی۔ کاش ان میں سے دو ہی چار ہمارے
کرہ کی حالت اور اس کا انتظام دیکھتے، اور درس حاصل کرتے، لیکن آپ لوگ سمجھ
سکتے ہیں، کہ میں ایسا نہ کر سکتا تھا۔ اور غالباً یہی سب سے بڑا نقص ہے۔ جو ہم اپنی ترقی
میں محسوس کرتے ہیں، میں نے اپنے عہد سیاحت میں اسطرف ہی کامل توجہ کی۔ کہ
ان لوگوں سے کچھ گفتگو کر سکوں، اور ان کو اپنا مافی الضمیر بتا سکوں۔ لیکن کرۂ ارض کا
باشندہ کسی مفہوم کے اخذ کرنے کے لیئے مجبور ہے۔ کہ پہلے کوئی چیز اس کے کانوں کو متاثر

کر سکے، اور پھر وہ دماغ سے کام لے کر اس کا مطلب معلوم کرے، اور افسوس ہے کہ میں ان کے سامعہ پر کسی چیز سے اثر ڈال سکتا تھا۔ اور اگر اس میں کامیاب ہوجاتا تو کیونکر ممکن تھا۔ کہ وہ میری زبان کو جو زیادہ تر حرکات و اشارات کی زبان ہے، آسانی سے سمجھ سکیں گے۔

ہرچند مجھے معلوم ہے کہ میرا یہ بیان ان کے لئے کسی طرح مفید نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اول تو یہ ان تک پہنچ ہی نہیں سکتا، اور اگر پہنچ بھی جائے، تو بھی کیا امید ہے، کیونکہ جس قوم نے اپنے مذہب کی زندہ کتاب اور اس کی تعلیمات کو بھلا دیا، وہ ایک سیاح کے بیان کی کیا وقعت کر سکتی ہے، لیکن حقیقتاً اس سے مقصود ان کو فائدہ پہنچانا نہیں ہے، بلکہ اپنی قوم کے لئے سرمایۂ عبرت فراہم کرنا ہے، تاکہ وہ غور کریں۔ اور سمجھیں کہ قوموں کے عروج و زوال میں کیسی کیسی معمولی باتوں سے انقلاب عظیم پیدا ہو چکا ہے، مگر اس لحاظ سے کہ مجھے اور میری تمام قوم کو مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی ہے،

میں آخر میں خود ہی دعا کرتا ہوں، اور آپ لوگوں سے بھی ہم آہنگ ہونے کی التجا کرتا ہوں۔ کہ اسوقت جب آپ لوگ اپنی دعائے نیم شبی کے لئے آمادہ و تیار ہوں قوم کو فراموش نہ کریں۔ اور درگاہ رب العزت میں التماس کریں کہ خدایا! تیرے حیطۂ اختیار و قدرت سے یہ کسی طرح باہر نہیں، کہ گرے ہوؤں کو سنبھال لے جس طرح تو عقلیں چھین سکتا ہے، اسی طرح تو دے بھی سکتا ہے، اس لئے مسلمانوں پر رحم کر، ان کو وہی راستہ دکھا، جو تو نے پہلے دکھایا تھا۔ اور ان کو توفیق عطا کر کہ تیرے احکام کی پابندی کریں۔ اور وہی کریں، جو تو نے اپنے رسول آخر الزماں کے ذریعہ ان تک پہنچایا تھا۔